آزاد کے افسانے

مولانا ابوالکلام آزاد

ادارۂ فروغِ ادب
لکھنؤ اسٹریٹ ۔ کراچی ۔ ۲

قیمت مجلد 2.50

امانت

ایوان ٹروتیج نے اپنے دوستوں کو مضطرب آواز اور زرد چہرے کے ساتھ ذیل کا واقعہ سنایا۔

۱۹۳۸ء کے کرسمس کی رات بہت ہی اندھیری تھی۔ میں اپنے ایک دوست کے یہاں دیر تک روحانی جلسے میں بیٹھا رہا مجھے تاریکی میں اپنے گھر لوٹنا تھا۔

اس زمانے میں ماسکو کی ایک ایسی گلی میں میرا قیام تھا۔ جو شہر میں سب سے زیادہ وحشت ناک اور تاریک گلی تھی۔ جب میں اس میں سے گزرتا؟ ڈراونے خیالات میرا دماغ

پریشان کر دیا کرتے تھے۔

روحانی جلسے میں آخری جملہ جو میں نے سنا تھا، وہ خاص میری ذات کے متعلق تھا۔ مشہور فیلسوف امپیرا کی روح کی نسبت ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ جلسے میں شریک ہے۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تیری موت قریب آگئی ہے۔ جلد خدا کے سامنے توبہ کر۔"

میں ڈر گیا۔ پھر سوال کیا، مزید کتنے دن باقی ہیں۔

"تیری زندگی ختم ہو گئی۔ آج ہی توبہ کر لے۔" یہ میرے سوال کا جواب تھا۔ میں...... علم الارواح کا قائل نہیں ہوں تاہم موت کا خیال مجھے ہمیشہ خوف زدہ کر دیا کرتا تھا۔ ایک عجیب طرح کی اُداسی مجھ پر چھا جاتی تھی۔

میں بدحواس جلسہ گاہ سے بھاگا۔ اور اپنے گھر کی راہ لی۔ اوپر کی منزل پر پہنچ کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس وقت بھی میرا خوف سے بُرا حال تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ میں ختم ہو رہا ہوں۔ کمرہ تاریک

تھا۔ اس پر ہوا تیز چل رہی تھی۔ کھڑکی کے شیشوں سے جھونکے ٹکرا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عناصر بھی خوف و دہشت کی حالت میں مضطرب ہو رہے ہیں۔

" اگر امپیتوزا کی پیشن گوئی ٹھیک ہے"۔ میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا"۔ اگر اسں سنگدل فیلسوف کی روح نے سچ کہا ہے۔ تو بس آج کی رات میرا خاتمہ ہے یہ واویلا کرنے والی ہوائیں میرا نوحہ کریں گی۔ یہ کالی بدلیاں ماتم کی صفیں بچھائیں گی۔ افسوس میری زندگی ...."

میں نے دیا سلائی جلائی۔

" میں " میں گلا پھاڑ کر بے خودی سے چلایا۔ اور دروازہ کی طرف بھاگا۔ سر سے پاؤں تک بدن کانپ رہا تھا تاتیلئہ غلام گردش میں پہنچ کر میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں تھیں۔ میں نے کمرے میں دیکھا۔ اس وقت بھی میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ دل دھڑک رہا تھا عین کمرے کے وسط میں مُردے کا تابوت رکھا تھا۔ اس پر

اَرغوانی غلاف چڑھا تھا۔ اور صلیب رکھی تھی۔ میں نے صرف ایک ہی جھلک دیکھی تھی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے۔ کہ مجھے اس کا ہر حصّہ نظر آ گیا۔ آج تک اس کا پورا نقشہ میرے ذہن میں محفوظ ہے۔

یہ ایک لڑکی کا تابوت تھا۔ چونکہ بہت چھوٹا تھا، اور رنگ و آرائش ویسی ہی تھی۔ جیسی کہ لڑکیوں کے تابوتوں پہ کی جاتی ہے۔

میں شیر کی طرح دینے پر پہنچا۔ اور سیلاب کی تیزی سے اترنے لگا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے۔ کہ گرنے لگا۔ ایک نہایت ہی خوفناک رُعب اپنی پوری قوّت سے مجھے دھکیل رہا تھا سڑک پر میں نے جاری سے ایک روشنی کا کھمبا دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لیا۔ کھمبا مینہ سے بھیگا ہوا تھا۔ برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ جسم نے سردی محسوس کی تو میرے ہوش و حواس واپس آنے لگے۔

اگر کمرے میں آگ لگی ہوتی ــــ میں خیال کرنے لگا۔ بلکہ

اس میں چور کھڑا ہوتا۔ شبیر ٹہلتا ہوتا۔ دیوانہ کتا بیٹھا ہوتا اگر اس کی چھت بھی اچانک گر جاتی۔ تو بھی مجھے تعجب نہ ہوتا۔ میں اسے ایک معمولی بات سمجھتا۔ مگر لاش، ایک مکمل تابوت! اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا میرے مکان میں تابوت کیوں کر آیا۔ کون لایا۔ ؟ ایک امیر لڑکی کا تابوت، سونے چاندی کے کام سے آراستہ۔ ایک معمولی نوکر کے حقیر کمرے میں اسے کون لایا۔ ؟ معلوم نہیں وہ خالی ہے یا لاش رکھی ہے ...... ؟

اچانک مجھے خیال آیا اگر یہ معجزہ نہیں تو کوئی ہولناک جرم ہے۔

لاکھ لاکھ سوچا کوئی بات سمجھ میں نہ آئی، دروازے پر قفل چڑھا تھا۔ میں پھر سوچنے لگا۔ کنجی ایسی مخفی جگہ رکھی تھی، کہ میرے خاص دوستوں کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ ممکن ہے کسی دوست نے یہ موت کا تحفہ میرے لئے مہیا کیا ہو۔ شاید کوئی مزدور غلطی سے لے آیا ہو لیکن مزدور

مزدوری لئے بغیر کیوں چلا جاتا ۔۔۔ ؟ اور یہاں مرغزدہ تابوت کیوں لایا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

پھر میرے پراگندہ دماغ میں ایک اور خیال آیا۔ ممکن ہے یہ کارروائی اسی رُوح کی ہو۔ جس نے آج رات میری موت کی خبر دی۔ شائد یہ تابوت میری لاش کے لئے لایا گیا ہو! لیکن یہ ناممکن ہے۔ یہ تابوت میرے قد سے چھوٹا ہے اب پھر بارش شروع ہوگئی۔ گویا میرے قتل کے لئے آسمان سے یورش ہورہی ہے۔ ہوا اتنی تیز تھی۔ کہ میرا اوور کوٹ اڑا جارہا تھا۔ میں بھیگ کر شرابور ہوگیا۔

"مجھے پناہ لینی چاہیئے" میں نے اپنے دل سے کہا۔ لیکن کہاں ؟ کمرے میں جہاں "تابوت" رکھا ہے ناممکن اگر میں وہاں گیا تو یقیناً دیوانہ ہو جاؤں گا۔

مگر اس پانی اور سردی میں سڑک پر کھڑا رہنا بھی مشکل تھا۔ میں نے فوراً اپنے دوست روسٹوف نامی کے گھر کی راہ لی وہ بھی ایک تنگ و تاریک گلی میں ایک کمرے میں رہتا تھا

دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے ایک طاق میں ہاتھ مارا تو کنجی مل گئی۔ قفل کھول کر اندر چلا گیا۔ میرا کوٹ بھیگ گیا تھا۔ میں نے اسے اتار کر زمین پر ڈال دیا اندھیرے میں پاؤں تلے ایک کرسی سے ٹھوکر کھائی۔ میں اسی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تاریکی سخت تھی۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ہوا تیز تھی۔ کھڑکیاں ہل رہی تھیں۔ باہر کلیسا کے گھنٹے کرسمس کی خوشی میں بج رہے تھے۔

میں نے جیب سے ڈبیا نکال کر دیا سلائی جلائی۔

اُف یہاں بھی! میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی میں دیوانہ وار بھاگ کر کمرے سے باہر گرا۔

یہاں بھی تابوت رکھا تھا۔ لیکن میرے کمرے کے تابوت سے بڑا تھا۔ اور سیاہ غلاف سے ڈھکا تھا۔ سیاہ غلاف نے اسے اور بھی زیادہ ہیبت ناک بنا دیا تھا۔

یہاں بھی وہی تابوت تھا۔ میں سوچنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے یہ میرا وہم و خیال ہے میری نگاہ دھوکہ کھا رہی ہے ممکن

ہے۔ کہ میں جہاں جاؤں میرے . . . . . . لئے ایک خوفناک
تابوت پہلے سے مہیا ہو جائے۔ ضرور میرے اعصاب میں
آج خلل آگیا ہے۔ جہاں جاتا ہوں تابوت ہی نظر آتا ہے
میں ضرور پاگل ہو گیا ہوں۔ جنون کا سبب صاف ظاہر ہے
اسی منحوس روحانی جلسے اور اسپونزا کی شیطانی روح نے میرا
دماغ خراب کر ڈالا۔

میں تھک کر زمین پر بیٹھ گیا۔ دونوں کنپٹیاں زور سے
دبالیں۔

"الٰہی میں کیا کروں کہاں جاؤں ؛ آہ میں پاگل ہو گیا"
یہ کہتے ہوئے بے اختیار میرے آنسو نکل گئے۔

قریب تھا کہ میرا سر پھٹ جائے۔ میرے پیروں میں سکت
باقی نہیں رہی تھی۔ مینہ کا وہ زور تھا۔ کہ خدا کی پناہ
میرا تمام بدن سردی سے کانپنے لگا۔ نہ سر پر ٹوپی تھی
نہ جسم پر کوٹ۔ میں انہیں لینے کمرے میں جا بھی نہیں سکتا
تھا کیوں کہ وہاں . . . . بہت ہی ہولناک

ناقابلِ برداشت منظر تھا۔

میرے سر کے بال نیزہ کی طرح سیدھے کھڑے ہو گئے اور ٹھنڈا پسینہ پیشانی سے بہنے لگا۔ حالانکہ اب مجھے کامل یقین ہو چکا تھا۔ کہ جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا ہے۔ وہ محض ایک طرح کے اعصابی مرض کا نتیجہ اور وہم و خیال ہے حقیقت میں کچھ بھی نہیں۔

"اب کیا کروں ؟ کہاں جاؤں ؟" بار بار یہی سوال دہراتا تھا۔ یکایک مجھے ایک دوسرا دوست گوڈ سارٹ یاد آگیا۔ اس نے حال ہی میں ڈاکٹری کی سند حاصل کی تھی۔ اور میرے قریب رہتا تھا۔ میرے ساتھ روحانی جلسے میں شریک تھا۔

میں بے تحاشا اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا کمرہ مکان کی سب سے اونچی منزل پر واقع تھا۔

لیکن میں ابھی زینے ہی پر تھا۔ کہ اوپر سے خوفناک شور سنائی دیا۔ ایسا معلوم ہوا۔ جیسے کوئی آدمی بدحواسی سے

ادھر ادھر دوڑ رہا ہے۔ اور زور زور سے پاؤں زمین پر مار رہا ہے۔

فوراً ہی ایک دہشت ناک آواز میرے کانوں میں آئی "مدد مدد دوڑو! دوڑو!" اور اس کے ساتھ ہی ایک شخص اوپر سے نیچے نحاشا گرتا ہوا مجھ سے ٹکرایا۔ "سارو ف! سارو ف دوست تم ہو؟ کیا ہوا؟" میں بے اختیار چلا اٹھا۔ کیونکہ یہ شخص میرا دوست تھا۔ سارو ف ہی تھا۔

زینے پر دھندلی روشنی تھی۔ سارو ف نے آتے ہی دیوانہ وار میرے مونڈھے پکڑ لئے۔ اس کا تمام بدن کانپ رہا تھا۔ چہرہ زرد تھا۔ آنکھیں عجیب قسم کی وحشت ظاہر کر رہی تھیں۔ "سارو ف!" میں پھر چلایا۔

"ایجوت" اس کی لرزتی ہوئی آواز بلند ہوئی "ایجوت تم ہو کیا واقعی تم ہی ہو۔؟" اس نے مجھے بغور دیکھا اور لمبی سانس لی۔

"یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ مردے کی طرح پیلے پڑ گئے ہو۔

اور تمہاری صورت کیسی ڈراؤنی ہو رہی ہے۔ ؟ بالکل مُردہ معلوم ہوتے ہو ؟" میرا جواب تھا۔

ٹھہرو !" اس نے جلدی سے کہا۔" ذرا دم لینے دو آہ میں اس وقت تم سے مل کر کتنا خوش ہوا ہوں۔ ؟ جان جاتے جاتے بچی محافلِ ارواح کے جلسوں پر خدا کی لعنت علم الارواح پر ہزار لعنتیں۔ اس جلسے نے نہیں معلوم میرے لئے کیسی کیسی ہولناک چیزیں پیدا کردیں ؟ کیا تم یقین کروگے کہ جوں ہی میں اپنے کمرے میں داخل ہوا ــــــــ

اُف کیسا ڈراؤنا منظر میں نے دیکھا۔ کمرے کے عین وسط میں ایک تابوت رکھا ہے۔" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ یہ تو بعینہٖ خود میری سرگذشت تھی۔ میں نے چیخ کر پوچھا۔

"تابوت کیا کہتے ہو "تابوت" ؟

اس نے صاف لفظوں میں کہا۔" تابوت ! ایک حقیقی تابوت میں بزدل نہیں ہوں لیکن اس منظر سے تو شیطان بھی بے

ہوش ہو جائے گا "
میں پھر خوف سے کانپنے لگا۔ میں نے بمشکل اپنے دونوں مشاہدے اسے بیان کئے۔ میں نے کہا "خدایا عجیب طرح کی ہولناکی ہے۔ میں نے اپنے کمرے میں تابوت دیکھا اور اب تم کہتے ہو کہ تم نے بھی اپنے کمرے میں تابوت دیکھا ہے ...... ؟"

ہم .... چوکھٹ پر کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ہم دونوں مبہوت تھے۔ ہمیں خیال ہوا شاید ہم سو رہے ہیں۔ یہ شبہ بیک وقت دونوں کے دماغ میں گزرا۔ اس لئے ایک دوسرے کو گھونسے مارنے لگے۔ تاکہ معلوم کرلیں کہ ہم واقعی جاگ رہے ہیں۔ یا خواب میں ہیں۔
"نہیں ہم خواب میں نہیں ہیں۔" سارجنٹ نے کہا
"ہم مُکّے کی چوٹ محسوس کرتے ہیں۔ ضرور جاگ رہے ہیں ہم نے جو تابوت دیکھے ہیں۔ یقیناً وہ تابوت ہی ہیں۔ ہمارا وہم و خیال نہیں ہے۔ اب بتاؤ کیا کریں ـــ ؟"

اب ہم مکان کی سیڑھی پر آکر کھڑے ہوگئے۔ اور دیر تک سوچتے رہے کہ کیا کرنا چاہیئے — ؟ آخر طے ہوا کہ ہمت کر کے اوپر چلیں۔ اور نوکر کو جگا کر کمرے میں جائیں۔

نوکر ہاتھ میں شمع لئے ہوئے اندر آگیا۔ ہم پیچھے پیچھے چلے، واقعی کمرے کے عین وسط میں ایک تابوت رکھا تھا اس میں سفید ریشمیں چادر پڑی تھی ۔کناروں پر سونے کے تاروں کا کام تھا۔ جابجا چاندی کے پھول —

تابوت دیکھ کر نوکر نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اب ہم حقیقت معلوم کر سکتے ہیں۔" میرے دوست نے رک رک کر کہا۔ کیونکہ وہ پورے جسم سے کانپ رہا تھا۔

"دیکھنا چاہیئے معلوم نہیں کیا ہے۔ تابوت خالی ہے۔ یا اس میں کوئی لاش رکھی ہے۔ ؟"

بڑے پس و پیش کے بعد سارجنٹ نے ہمت کی چند قدم آگے بڑھا۔ اور تابوت کا ڈھکنا الٹ کر پیچھے ہٹ گیا۔ ہم نے جھک کر دیکھا تابوت بالکل خالی تھا۔ نعش کی جگہ

ایک لفافہ پڑا تھا۔

میرے دوست نے لفافہ اٹھا لیا۔ اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا۔ اس کے اندر حسب ذیل سطریں مرقوم تھیں۔

میرے پیارے دوست ساز دوت

تمہیں معلوم ہے۔ کہ ہماری حالت کس درجہ بگڑ چکی ہے مختصر لفظوں میں واقعہ یہ ہے۔ کہ میرا بھائی دیوالیہ ہو گیا ہے۔ کل اس کا تمام سامان نیلام ہو جائے گا۔ تم جانتے ہو۔ اس کی دوکان میں تابوتوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ (کیونکہ شہر بھر کیلئے وہی تابوت فراہم کرتا ہے۔) اب ہمارے لئے فقر و فاقہ کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ ہمارے خاندان نے مشورہ کے بعد طے کیا ہے۔ کہ جتنے تابوت بھی راتوں رات نکالے جاسکتے ہیں۔ نکال دیئے جائیں۔ تاکہ وہ نیلام سے بچ جائیں۔ چنانچہ اپنے دوستوں کے یہاں ایک ایک تابوت بھیج دیا ہے۔ ایک تابوت تمہارے یہاں بھی رکھوا دیتے ہیں تم مطمئن رہو۔ ایک ہفتہ سے زیادہ تمہیں اس کی حفاظت

نہیں کرنی پڑے گی۔ اور ہم اس کے لئے تمہارے اور تمام دوستوں کے نہایت شکر گذار ہوں گے۔ تمہارا مخلص

" ایوان گوڈین "

اس واقعہ کے بعد تین مہینے تک میں اپنے اعصاب کا علاج کرتا رہا۔ اب تک یہ حالت ہے۔ کہ جب کبھی شام کو گھر لوٹتا ہوں۔ تو دروازے پر خوف سے رک جاتا ہوں۔ کمرے میں تابوت کا منظر یاد آجایا کرتا ہے۔

عدلِ عام

سودہؓ بنت عمارہ حضرت علیؓ علیہ السلام کے جانثاروں میں تھی۔ جنگ صفین میں، اس کے پُرجوش اور رجزیہ شعروں نے شامیوں پر عرصہ کارزار تنگ کر دیا تھا۔ اس کے بھائی نے نہایت پامردی سے شاہی شجاعوں کو شکست دی تھی۔

جب امیر معاویہؓ تخت سلطنت پر متمکن ہو گئے۔ تو ایک دن یہ اپنے قبیلے کی شکایت لے کر دربار میں پہنچی۔ یہ وہ وقت تھا۔ کہ خلافت راشدہ کا دورِ حریت ختم ہو چکا تھا اور

امیر معاویہؓ رومی و ایرانی شہنشاہیت کے جاہ و جلال سے تخت خلافت کو روشناس کرا چکے تھے۔ پھر بھی اسلام کی پیدا کی ہوئی روحِ حریت کا یہ حال تھا۔ کہ قبائل کی ایک معمولی بڑھیا عورت دربار ظاہر کر دیتی تھی۔ امیر کی نظر جب سودہ پر پڑی تو بے اختیار بول اٹھے۔ "کیا تم ہی وہ سودہ ہو جو صفین کی لڑائی میں میری جماعت کے خلاف نہایت جوش و خروش سے یہ اشعار سنا رہی تھیں ؎

شمر کفعل ابیک یا ابن عمارۃ
یوم الطعان وملتقی الاقران

اے فرزند عمارہ! نبرد آزمائی اور جنگجوئی میں اپنے باپ کے سے کارنامے دکھا۔

وانصر علیا و الحسین و رھطہ
واقصد لھند وابنھا بھوان

علیؓ کی حسینؓ کی اور ان کے خاندان کی حمایت کرو۔ اور اس کے بیٹے کو خوار کر دے

ان الامام اخو النبی محمد
عَدا لمہدیٰ وضاد قۃ الایمان
امام دینی علی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی ہیں۔ ہدایت کی نشان اور ایمان کا منارہ ہیں۔

" ہاں قسم خدا کی" سودہ نے فوراً جواب دیا۔
" میرے جیسا آدمی نہ حق سے منہ پھیر سکتا ہے۔ نہ جھوٹ بول کر مغذرت کر سکتا ہے۔ وہ میں ہی تھی۔"

تم نے یہ حرکت کیوں کی تھی۔" امیر معاویہ نے سوال کیا۔
" علی علیہ السلام کی محبت اور اتباع حق کی وجہ سے۔" سودہ کا جواب تھا۔

" لیکن علی نے تمہیں کیا بدلہ دیا۔" امیر نے پھر سوال کیا۔
" پچھلی باتوں کے تذکرے سے کیا فائدہ" سودہ کا جواب تھا۔
" بہرحال" امیر معاویہ نے کہا۔ " تمہارے بھائی کا معاملہ بھلایا نہیں جا سکتا۔ مجھے کسی سے بھی اتنی تکلیف نہیں پہنچی جتنی تمہارے بھائی اور تمہاری قوم سے پہنچی تھی۔"

"سچ ہے" سودہ نے جرأت سے کہا "میرا بھائی حقیر آدمی نہ تھا۔ کہ بھلادیا جاسکے واقعی وہ ویسا تھا۔ جیسا خنساء نے اپنے بھائی صخر کے بارے میں کہا ہے۔" ؎

وان صخراً لتاتم الھداۃ بہ

کانہ علم فی راسہ نار

(صخر وہ ہے جس کی پیروی رہبر کرتے ہیں۔ گویا پہاڑ ہے جس کی چوٹی پر آگ روشن ہے) "سچ ہے تیرا بھائی ایسا ہی تھا۔" امیر نے تصدیق کی ـــــ" اچھا کہو میرے پاس کیوں آئی ہو؟" "تم اب آدمیوں کے سردار اور ان کے معاملات انجام دینے والے بن گئے ہو"۔ سودہ نے کہا۔

" خدا تم سے ہماری بابت اور ہمارے حقوق کی بابت سوال کرے گا۔ تمہاری طرف سے ہمارے ہاں ایسے احکام آتے رہتے ہیں جو تمہاری شوکت پر گھمنڈ کرتے اور تمہاری قوت سے ہماری کرتے ہیں۔ یہ ہمیں اس طرح کاٹ رہے ہیں جس طرح کھیتی کاٹی جاتی ہے۔ یہ ہمیں ذلیل کرتے ہیں ہم سے بدسلوکی کی

کرتے ہیں تمہارا موالی لبسر بن ارطاء تمہاری طرف سے آیا اور
میرے آدمی مار ڈالے ۔ اور میرا مال چھین لیا۔ اور مجھے ایک ایسی
بات کہنے پر مجبور کرنا چاہا۔ جو میرے مُنہ سے نکلنا نا ممکن ہے
یعنی حضرت علی علیہ السلام سے بیزاری اگر اطاعت واجب نہ ہوتی
تو ہمارے اندر بھی قوت واستعداد تھی۔ بہرحال اسے معزول کردو
اور ہمارے شکریہ کے مستحق ہو ورنہ ہم پھر تمہیں دکھا دینگے"
۔ تو مجھے دھمکاتی ہے۔" امیر نے کہا" میں نے ارادہ کرلیا ہے
کہ تجھے سرکش اونٹ پر بٹھا کر لبسر ابن ارطاء کے پاس بھیجدوں
تاکہ جو سزا چاہے دیدے"
سودہ نے سر جھکا لیا اور پھر سر اٹھایا اور یہ شعر پڑھے۔
صلی الالہ علی جسم تضمنہ
قبر فاصبح فیہ العدل مدفونا
خدا کی رحمت اس جسم پر جسے قبر نے چھپا لیا ہے۔ اور عدل
اس میں مدفون پڑا ہے۔
قد حالف الحق لا یبغی بہ بدلا

دضادَ بالحق دالایمان مقرونا

دہ ہمیشہ حق کے ساتھ تھا۔ اسے کبھی نہیں چھوڑتا تھا۔ اس کا نام حق دایمان کے ساتھ ہمیشہ کیلئے جڑ گیا ہے۔

" یہ کون ہے " امیر نے انجان بن کر سوال کیا۔

" علی ابن طالب علیہ السلام " سودہ کا برجستہ جواب تھا۔

"اس نے تیرے ساتھ کیا کیا کہ تیری نظر میں ایسا بن گیا" امیر نے پوچھا۔ " انہوں نے ہم سے صدقہ وصول کرنے کے لئے ایک شخص کو مقرر کیا تھا " سودہ نے کہا۔ " میرے اور اس شخص کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ میں اس کی شکایت لے کر امیرالمومنین کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپ اس وقت نماز کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی نماز چھوڑ دی اور بڑے ہی لطف و نرمی سے میرا حال پوچھا۔ میں نے تمام واقعہ بیان کر دیا۔ آپ سنتے ہی رونے لگے، پھر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر فرمایا۔ خدایا تو مجھ پر اور میرے اعمال پر گواہ ہے۔ میں نے انہیں تیری مخلوق پر ظلم کرنے کا حکم نہیں دیا۔ اس کے بعد اپنی جیب سے

ایک کھال کا ٹکڑا نکالا۔ اور اس پر لکھا۔ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس روشنی آچکی ہے۔ لہٰذا ناپ تول ٹھیک کرو لوگوں کا حق نہ مارو۔ زمین پر فساد برپا نہ کرو۔ اللہ کا بقیہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔ میں تم پر محافظ نہیں ہوں۔ میری یہ تحریر پڑھنے کے بعد جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہمارا کام ہو۔ اسے محفوظ رکھو۔ یہاں تک کہ وہ شخص پہنچ جائے۔ جو تجھ سے وہ سب وصول کرے۔ یعنی اس حاکم کو معزول کر دیا۔ میں نے امیرالمومنین کے ہاتھ سے خط لیا واللہ اس پر انہوں نے نہ تو کوئی مہر لگائی۔ نہ اسے بند ہی کیا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے حرف بہ حرف پڑھ لیا۔"

ابن ابی طالب نے تمہیں حکام پر جری بنا دیا ہے۔" امیر معاویہ نے کہا۔ "بہت دیر ہوگئی یہ جرأت تم سے دور ہوگی"

پھر حکم دیا کہ سودہ کا مال واپس کر دیا جائے۔ اور اس سے برتاؤ اچھا کیا جائے۔ "یہ حکم میرے لئے خاص ہے، یا میری پوری قوم کے لئے۔ ؟

سَودہ نے سوال کیا۔

"تجھے دوسروں سے کیا سروکار" امیر معاویہ نے کہا۔

"تو واللہ یہ کمینگی اور بدکاری ہے" سَودہ نے کہا۔ "اگر عدل عام نہیں تو میں اسے قبول نہیں کرتی"

مجبوراً امیر معاویہ نے حکم دیا کہ اس کے پورے قبیلے کی بابت فرمان لکھ دیا جائے

"الہلال ۱۹۳۷ء"

حق

ایک موسم حج میں ضعیف العمر بنت الحارث بن عبدالمطلب امیر معاویہؓ ابن ابی سفیان کے دربار میں حاضر ہوئی۔

"میرے بھتیجے! تو کیا ہے۔" اروی نے کہا۔ "تو نے خدا کی نعمت سے کفران کیا۔ اپنے بھائی (امیرالمومنین علی علیہ السلام) کے حق کا لحاظ نہ کیا۔ اپنے نام کے سوا ایک نیا لقب اختیار کیا۔ اور دوسرے کے حق پر قابض ہو گیا۔ (یعنی خلافت پر) حالانکہ اسلام میں نہ تو خود تو نے کوئی خدمت کی نہ تیرے آباؤ اسلاف نے تم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے حق سے انکار کیا تھا

اس پر خدا نے تمہاری قسمتیں بگاڑ دیں۔ تمہیں ذلیل و خوار کیا۔ حق حقداروں تک پہنچ گیا۔ اللہ کا بول دبالا ہوا۔ اگرچہ مشرکوں پر یہ ظفر بندی بہت شاق تھی۔ اس دین میں ہم اہل بیت کا درجہ اور حصہ سب لوگوں سے زیادہ ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس حال میں فوت ہوئے کہ مرحوم و مغفور تھے خدا کے حضور میں پسندیدہ تھے۔ آپ کے بعد ہم اہل بیت کے ساتھ تم نے وہ برتاؤ کیا۔ جو قوم موسے کے ساتھ خاندان فرعون نے کیا تھا کہ ان کے مردوں کو قتل کرتے تھے؛ اور عورتوں کو زندہ رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہمارا شیرازہ بندھ نہ سکا۔ ہم پر کوئی سختی بھی آسان نہ ہوئی ہماری انتہا جنت ہے۔ تمہاری انتہا دوزخ ہے۔"

"گمراہ بڑھیا۔" عمرو بن العاص جو دربار میں موجود تھے بے اختیار پکار اٹھے۔

"اپنی زبان روک شرم سے آنکھ نیچی کر ــــ"

"تو کون ہے ؟ تیری ماں مرے" اروی نے خفگی سے کہا۔

"عمرو بن العاص " لوگوں نے جواب دیا۔
اروی نے کہا۔" تو مجھے بولنے کی جرأت کرتا ہے۔ پلنے عیب چھپے رہنے دے۔ اپنی خیریت منا۔ واللہ تو قریش میں نہ تو خالص حسب نسب رکھتا ہے۔ نہ اچھی صلاحیت کا مالک ہے۔"
"بیوقوف بڑھیا۔ مروان ابن الحکم نے کہا۔" تیری بینائی بھی تیری عقل کے ساتھ جا چکی ہے۔ تیری شہادت معتبر نہیں۔"
"صاحبزادے تم بھی بولے " اروی نے کہا۔ "واللہ حکم سے زیادہ تو سفیان بن الحارث بن کلاہ سے ..... مشابہ ہے۔"
پھر وہ معاویہؓ کی طرف مخاطب ہوئیں۔
"واللہ ان لوگوں کو تو نے ہی مجھ پر جرأت دلائی ہے حالانکہ تیری ماں اُحد کی لڑائی میں حمزہ کے قتل کے بعد یہ کہتی تھی کہ ہم نے تم سے جنگ بدر کا بدلہ لے لیا۔ لڑائی لڑائی کے بعد آگ کی طرح شعلے رکھتی ہے۔
عتبہ دمینہ باپ تھا۔ پر مجھے صبر نہیں ہو سکتا تھا۔ میرا باپ چچا بھائی حمزہ انہیں میں بھول نہیں سکتی تھی۔ یہ سب جنگ

بدر میں قتل ہوئے تھے)

اے وحشی (اے اس حمزہ) تونے میرا دل ٹھنڈا کیا میری منت پوری کر دی ———

"وحشی" کا شکریہ عمر بھر مجھ پر واجب ہے۔ یہاں تک کہ میری ہڈیاں قبر میں غائب ہو جائیں۔ تیری ماں کے جواب میں میں نے کہا تھا۔

اے بیہودہ بڑے کافر کی بیٹی! بدر میں اور ہر دن میں تجھے رسوائی ملے۔

خدا تجھ پر صبح سے پہلے دراز قد خوبصورت ہاشمیوں کی غارت گری نازل کرے۔

تیغ بُراں سے تجھے کاٹے حمزہؓ میرا شیر ہے۔ اور علیؓ میرا بازو ہے

وحشی نے بے آبروئی کر ڈالی۔ اب فاحشہ عورتوں کے لئے تیرے بعد کوئی فخر باقی نہیں رہا"

"تمہارا برا ہو"! امیر معاویہؓ نے عمرو بن العاص اور

مروان بن الحکم سے کہا۔ "تمہیں نے اس خاتون کو مجھ پر خفا کرادیا اور یہ باتیں سنوائیں۔"

پھر اروی سے مخاطب ہوئے۔

"پھوپھی، اپنی ضرورت بیان کرو۔ عورتوں کی طرح یہ بکواس بند کرو۔"

"مجھے دو ہزار، دو ہزار، دو ہزار پورے چھ ہزار دینار دو" اروی نے مطالبہ کیا۔

"پہلے دو ہزار کس لیے؟" امیر نے سوال کیا۔

"میں حارث بن عبدالمطلب کے خاندان کے لئے کھیتی کی زمین میں کنواں خریدوں گی۔" اروی نے جواب دیا۔

"تم نے بہت خوب سوچا۔" امیر نے کہا۔ "اور دوسرے دو ہزار"

"خاندان عبدالمطلب کے نوجوانوں پر"

"بہت خوب اور تیسرے دو ہزار"

"مدینہ کی گرانی اور زیارت بیت اللہ کے خرچ پر"

"بہت خوب خیال ہے۔ میں نے منظور کیا۔ تمہاری خاطر ہمیشہ

بدنظر ہے گی۔" امیر نے خوشامد سے کہا۔ اور تھوڑی دیر چپ
رہ کر امیر نے پھر سوال کیا۔

" بخدا اگر علیؓ موجود ہوتے تو یہ رسم ہرگز منظور نہ کرتے۔"

" سچ ہے ۔" بدوی نے فوراً جواب دیا۔" علی امانت ادا
کرتا تھا۔ خدا کے حکموں پر چلتا تھا۔ مگر تو نے اپنی ذہانت ضائع
کردی۔ خدا کے مال میں خیانت کی۔ خدا کا مال غیر مستحقوں کو دے
ڈالا۔ خدا نے اپنی کتاب میں حقداروں کے حق مقرر کر کے بیان
کر دیئے ہیں۔ مگر تو نے خدا کے حکموں پر عمل نہیں کیا۔ لیکن علیؓ
نے ہمیں اپنے حق لینے کے لئے برابر بلایا۔ جو خدا نے ہمارے
لئے مقرر کر دیئے ہیں۔ مگر افسوس تمہاری لڑائی نے انہیں پورا
انتظام قائم کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔ میں تیرا مال نہیں لوں گی
کہ احسان جتاتا ہے۔ میں تو صرف اپنا حق مانگتی ہوں۔ ہم بھی
دوسروں کا حق لینا جائز نہیں سمجھتے

آہ! تیرے دانت ٹوٹیں اور تیری مصیبت سخت ہو جائے
تو اپنی زبان پر علیؓ کا نام لاتا ہے۔!

پھر وہ رونے لگی۔

معاویہؓ نے انہیں چھ ہزار دینار دیدیئے۔ اور کہا۔
”پھوپھی اسے جس طرح چاہو خرچ کرو۔ پھر جب کبھی ضرورت پڑے اپنے بھتیجے کو لکھنا۔ وہ ہر طرح تمہاری مدد کرے گا ۔۔۔!“

(”الہلال“ ۱۹۲۷ء)

۲
دو چور

ہجرت کی تیسری صدی قریب الاختتام ہے۔ بغداد کے تختِ خلافت پر المعتصم باللہ عباسی متمکن ہے۔ معتصم کے زمانے سے دارالخلافے کا شاہی اور فوجی مستقر سامرہ میں منتقل ہو گیا ہے۔ پھر بھی سرزمین بابل میں پندرہ لاکھ انسان بستے ہیں۔ ایران کے اسطخر، مصر کے اسکندریہ، اور یورپ کے روم کی جگہ اب دنیا کا تمدنی مرکز بغداد ہے۔ دنیا کی اس ترقی یافتہ مخلوق کا جسے انسان کہتے ہیں۔ کچھ عجیب حال ہے۔ یہ جتنا کم ہوتا ہے۔ اتنا ہی نیک اور خوش ہوتا ہے۔ اور جتنا زیادہ بڑھتا ہے۔ اتنی ہی

نیکی اور خوشی اس سے دور ہونے لگتی ہے۔ اس کا کم ہونا خود اُس کے لئے اور خدا کی زمین کے لئے برکت ہے۔ یہ جب چھوٹی چھوٹی بستیوں میں گھاس پھونس کے چھپّر ڈال کر رہتا ہے۔ تو کیسی خوش اور کس درجہ حلیم ہوتا ہے۔ محبت اور رحمت اس میں اپنا آشیانہ بناتی ہے۔ اور روح کی پاکیزگی کا نور اسی لئے جھونپڑیوں کو روشن کرتا ہے۔ لیکن جونہی یہ جھونپڑیوں سے باہر نکلتا ہے۔ اور اس کی بڑی بڑی بھیڑیں ایک خاص رقبہ میں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ خود اُس کی حالت میں ایک عجیب انقلاب ہو جاتا ہے۔ دولت سربفلک عمارتیں بناتی ہے اور حکومت و امارت شان و شکوہ کے سامان آراستہ کرتی ہے لیکن دوسری طرف نیکی رخصت ہو جاتی ہے۔ محبت اور فیاضی کا سراغ نہیں ملتا۔ اور امن و مساوات کی جگہ انسانی مصیبتوں اور شقاوتوں کا ایک لازوال دور شروع ہو جاتا ہے۔ وہی انسان کی بستی جو پہلے نیکی اور محبت کی دنیا اور راحت کی برکت کی بہشت تھی اب افلاس و مصیبت کا مستقر اور جرموں اور بدیوں کی دوزخ بن

جاتی ہے۔ وہی انسان جو جھونپڑیوں کے اندر محبت و فیاضی کا
بے بہا گوہر ہوتا ہے۔ شہر کے سر بفلک محلوں کے اندر بے مہری
اور خود غرضی کا پیکر ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے عالیشان مکانوں
میں بخشش لعمت کے دسترخوان پر بیٹھتا ہے۔ تو اس کے کتنے
ہی ہمجنس سڑک پر بھوک سے ایڑیاں رگڑتے ہیں۔ وہ عیش و
راحت کے ایوانوں میں حسن و جمال کی محفلیں آراستہ کرتا ہے،
تو اس کے ہمسایہ میں کتنوں کے آنسو نہیں تھمتے۔ اور کتنی ہی
بیوائیں ہوتی ہیں۔ جن کے بدنصیب سروں پر چادر کا ایک
تار بھی نہیں ہوتا۔ زندگی کی قدرتی یکسانی کی جگہ اب زندگی
کی مصنوعی رسمی تفاوتیں ہر گوشہ میں نمایاں ہو جاتی
ہیں۔ پھر جب انسانی بے مہری اور خود غرضی کے لازمی نتائج
برآمد ہونے لگتے ہیں۔ کمزوری اور بے نوائی سے مجبور ہو کر بدبخت
انسان جرم کی طرف قدم اٹھاتا ہے۔ تو اچانک دنیا کی
زبانوں کا سب سے زیادہ بے معنی لفظ وجود میں آجاتا ہے
یہ قانون اور انصاف ہے۔ اب بڑی بڑی شاندار عمارتیں

تعیر کی جاتی ہیں۔ اور ان کے دروازے پر لکھا جاتا ہے"۔
انصاف کے اس مقدس گھر میں کیا ہوتا ہے، کہ وہی انسان
جس نے اپنی بے رحمی اور تغافل سے مفلس کو چوری پر اور
نیک انسانوں کو بداطوار بن جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ قانون
کا پر ہیبت جبہ پہن کر آتا ہے، اور فرشتوں کا سا معصوم اور
راہبوں کا سا سنجیدہ چہرہ بنا کر حکم دیتا ہے۔ کہ مجرموں کو
سزا دی جائے کیوں ؟ اس لئے کہ اس نے چوری کی ہے۔ اس
بدبخت نے چوری کیوں کی۔ اس لئے کہ وہ انسان ہے، اور انسان
بھوک کا عذاب برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ وہ شوہر ہے
اور شوہر اپنی بیوی کو بھوک سے ایڑیاں رگڑتے ہوئے دیکھ نہیں
سکتا۔ اس لئے کہ وہ باپ ہے، اور باپ کی طاقت سے باہر ہے
کہ اپنے بچوں کے ان آنسوؤں کا نظارہ کرسکے، جو بھوک کی اذیت
سے ان کے معصوم چہروں پر بہہ رہے ہیں۔ پھر اگر بدقسمت
انسان قید خانہ اور تازیانہ کی سزائیں جھیل کر بھی اس قابل نہیں
ہو جاتا کہ بغیر غذا کے زندہ رہ سکے۔ تو مقدس انصاف اصلاح

اور انسانیت کا آخری علاج ہے۔ یہ ہے انسان کی شہری اور متمدّن زندگی کا اخلاق۔ وہ خود ہی انسان کو برائی پر مجبور کرتا ہے۔ اور خود ہی سزا بھی دیتا ہے۔ پھر ظلم بے رحمی کے اس تسلسل کو انصاف کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس انصاف کے نام نے دجو دنیا کی سب سے زیادہ مشہور مگر سب سے زیادہ غیر موجود حقیقت ہے)

چوتھی صدی ہجری کا بغداد دنیا کا سب سے بڑا شہر اور انسانی تمدّن کا سب سے بڑا مرکز تھا۔

اس لئے ضروری تھا۔ کہ انسانی آبادی اور تمدّن کے یہ تمام لازمی نتائج موجود ہوتے۔ گندگی میں مکھیاں اور دلدل میں مچھر اس تیزی سے پیدا نہیں ہوتے۔ جسقدر تیزی سے شہروں کی آب و ہوا جرم اور مجرموں کو پیدا کرتی ہے بغداد کے قیدخانے مجرموں سے بھرے رہتے تھے۔ پھر بھی اس کی آبادیوں میں مجرموں کی کوئی کمی نہ تھی۔

بغداد میں آج کل حسب طرح حضرت شیخ جنید بغدادیؒ

کی بزرگی و دور اندیشی کی شہرت ہے۔ اس طرح ابن ساباط کی چوری اور عیاری بھی مشہور ہے۔

پہلی شہرت نیکی کی ہے، دوسری بدی کی۔ دنیا میں بدی نیکی کی ہر چیز کی طرح اس کی شہرت کا مقابلہ کرنا چاہتی ہے۔ اگرچہ کر نہیں سکتی۔ دس برس سے ابن ساباط مدائن کے محل میں قید ہے اس کے خوفناک حملوں سے لوگ محفوظ ہو گئے ہیں۔ تاہم اس کی عیاریوں اور بیباکیوں کے افسانے لوگ بھولے نہیں وہ جب کبھی کسی دلیرانہ چوری کا حال سنتے ہیں تو کہنے لگتے ہیں، یہ دوسرا ابن ساباط ہے۔ دس برس کے اندر کتنے ہی ..... ابن ساباط پیدا ہو گئے۔ مگر پرانے ابن ساباط کی شہرت کا کوئی مقابلہ نہ کر سکا۔ بغداد والوں کی بول چال میں وہ جرائم کا شیطان اور برائیوں کا عفریت تھا۔

ابن ساباط کے خاندانی حالات عوام کو بہت کم معلوم ہیں جب وہ پہلی مرتبہ سوق التجار میں چوری کرتا ہوا پایا گیا تو کوتوالی میں اس کے حالات کی تفتیش کی گئی۔ معلوم ہوا کہ یہ بغداد کا

باشندہ نہیں ہے۔ اس کے ماں باپ طوس سے ایک قافلہ کے
ساتھ آئے تھے۔ راہ میں بیمار پڑے اور مرگئے۔ قافلے والوں
کو رحم آیا اور اپنے ساتھ لبنان پہنچا دیا۔ یہ اب سے دو برس
پہلے کی بات ہے۔ یہ دو برس اس نے کہاں اور کیونکر بسر کئے
اس کا حال کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ گرفتاری کے وقت اس کی
عمر پندرہ برس کی تھی۔ بچکو کو توالی کے چبوترے پر لٹا کر اس کو
تازیانے مارے گئے۔ اور چھوڑ دیا گیا۔

اس پہلی سزا نے اس کی طبیعت پر کچھ اس بُری طرح اثر ڈالا
کہ وہ اب تک ایک ڈرا سہما کمسن لڑکا تھا۔ اب اچانک ایک
دلیر اور بے باک مجرم کی روح اس کے اندر پیدا ہوگئی۔ گویا اس
کی تمام شقاوتیں اپنے ظہور کیلئے تازیانے کی ضرب کی منتظر تھیں
جرائم و اعمال کے تمام بھید اور بدیوں گناہوں کے تمام مخفی
طریقے جو کبھی اس کے وہم و گمان میں نہیں گزرے تھے اب
اس طرح اس پر کھل گئے۔ گویا کہ ایک تجربہ کار اور مشتاق
مجرم کا دماغ اس کے سر میں اتار دیا گیا ہو تھوڑے ہی دنوں

کے اندر وہ ایک پکا عیار اور ایک چھٹا ہوا۔ جرائم پیشہ انسان تھا۔

اب وہ چھوٹی چھوٹی چوریاں نہیں کرتا تھا۔ پہلی مرتبہ جب اس نے چوری کی تھی۔ تو دو دن کی بھوک اسے نانبائی کی دوکان پر لے گئی تھی۔ لیکن اب وہ بھوک سے بے بس ہو کر نہیں بلکہ اپنی جرائم پسندی سے وارفتہ ہو کر چوری کرتا تھا۔ اس لئے اس کی نگاہیں نانبائیوں کی روٹیوں پر نہیں صرافوں کی تھیلیوں اور سوداگروں کے ذخیرے پر پڑتی تھیں۔

دن ہو یا رات بازار کی منڈیوں میں یا امیر کا دیوان خانہ ہر وقت اور ہر جگہ اس کی کارستانیاں جاری رہتیں۔ اس کے اندر ایک فاتح کا جوش تھا۔ سپہ سالار کا عزم تھا۔ سپاہی کی مردانگی تھی۔ مدبّر کی سی دانشمندی تھی۔ لیکن دنیا نے اس کے لئے یہی پسند کیا۔ کہ وہ بغداد کے بازاروں کا چور ہو۔ اس کے لئے اس کی فطرت کے تمام جوہر نمایاں ہونے لگے۔ افسوس فطرت نے کس فیاضی سے بخشی۔ ۔ مگر انسان کس

بیدردی سے برباد کرتا ہے۔

۳

کچھ دنوں کے بعد ابن سا باط کی دراز دستیاں حد سے بڑھ گئیں۔ تو حکومت کی خصوصیت سے توجہ ہوئی۔ آخر ایک دن گرفتار کر لیا گیا۔ اب یہ ایک کمسن لڑکا نہ تھا۔ شہر کا سب سے بڑا چور رہا۔ عدالت نے فیصلہ کیا کہ ایک ہاتھ کاٹ ڈالا جائے، فوراً تعمیل ہوئی، اور جلاد نے ایک ہی ضرب میں اس کا پنجا الگ کر دیا۔

ابن سا باط کے ہاتھ کا کٹنا نہ تھا۔ بلکہ سینکڑوں نئے ہاتھوں کو اس کے شانوں سے جوڑ دینا تھا۔ معلوم ہوتا ہے دنیا کے سارے شیطان اور عفریت اس واقعہ کے انتظار میں تھے جوں ہی اس کا ہاتھ انہوں نے کاٹا۔ اپنے سینکڑوں ہاتھ اس کے حوالے کر دیئے۔ اب اس نے عراق کے تمام چور اور عیار جمع کر کے اپنا اچھا خاصا جتھہ بنا لیا اور فوجی ساز و سامان کے ساتھ لوٹ مار شروع کر دی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس

کے دلیرانہ حملوں نے تمام عراق میں تہلکہ مچا دیا۔

وہ قافلوں پر حملہ کرتا دیہاتوں میں ڈاکے ڈالتا محلسراؤں میں نقب لگاتا سرکاری خزانے لوٹتا اور جو یہ سب کچھ اس ہوشیاری اور فرزانگی سے کرتا کہ اس پر یا اس کے ساتھیوں پر کوئی آنچ نہ آتی۔ ہر موقعہ پر صاف بچ کر نکل جاتا۔ لوگ جب اس کے جرم کے کارنامے سنتے تو دہشت و حیرت سے مبہوت رہ جاتے۔ یہ ڈاکو نہیں ہے جرم کی ایک روح ہے وہ انسان کو لوٹ لیتی ہے مگر انسان اسے چھو نہیں سکتا۔ یہ بغداد والوں کا متفقہ فیصلہ تھا۔

— ۴ —

مگر ظاہر ہے یہ حالت کب تک جاری رہ سکتی تھی۔ آخر وہ وقت آ گیا کہ ابن ساباط تیسری مرتبہ قانون کے پنجے میں گرفتار ہو جائے۔ ایک موقعہ پر جب اس نے اپنے تمام ساتھیوں کو بحفاظت نکال دیا تھا اور خود نکل جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ حکومت کے سپاہی پہنچ گئے اور گرفتار کر لیا۔

اس مرتبہ وہ ایک رہزن اور ڈاکو کی حیثیت میں گرفتار ہوا تھا۔ اس کی سزا قتل تھی۔ ابن ساباط نے جب دیکھا کہ جلّاد کی تلوار سر پر چمک رہی ہے، تو اسی کے مجرمانہ خصائل نے اچانک ایک دوسرا رنگ اختیار کر لیا۔ وہ تیار ہو گیا کہ اپنے بچاؤ کے لئے اپنے ساتھیوں کی جانیں قربان کرنے۔ اس نے عدالت سے کہا۔ کہ اگر اسے قتل کی سزا نہ دی جائے تو وہ اپنے جتھے کے تمام چور گرفتار کرا دے گا۔ عدالت نے منظور کر لیا۔ اس طرح ابن ساباط خود تو قتل سے بچ گیا۔ لیکن اس کے سواسو سے زیادہ ساتھی اس کی نشاندہی پر موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ ان سواسو چوروں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس نے قتل ہونے سے پہلے ابن ساباط کے نام پر لعنت نہ بھیجی ہو۔ بدعہدی اور بے وفائی، برائی کا ایک درجہ ہے۔

— ۵ —

بہرحال ابن ساباط مدائن کے قیدخانے میں زندگی

کے دن پورے کر رہا ہے۔ اس کی آخری گرفتاری پر دس برس گزر چکے ہیں۔ دس برس کا زمانہ اس کے لئے کچھ مدت نہیں ہے۔ کہ ایک مجرم کی سیاہ کاریاں بھلا دی جائیں۔ دس برس گذرنے پر بھی اس کے دلیرانہ جرائم کا ذکر بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ لوگوں کو یہ بات تو کبھی بھولے سے بھی یاد نہیں آتی کہ اپن ساآباط ہے کہاں۔ اور کس حالت میں۔ کیونکہ معلوم کرنے کی انہیں ضرورت بھی نہیں ہے۔ البتہ وہ اس کے دلیرانہ کارنامے معلوم کر کے بھولتا نہیں چاہتے۔ اس تذکرہ میں ان کے لئے دلچسپی ہے۔ انہیں اپن ساآباط کی نہیں اپنی دلچسپیوں کی فکر ہے۔

انسان کی بے بہریوں کی طرح اس کی دلچسپیوں کا بھی کیسا عجیب حال ہے۔ وہ عجیب عجیب اور غیر معمولی باتیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ لیکن اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ اس کی دلچسپی کا یہ تماشا کیسی کیسی مصیبتوں اور شقاوتوں کی پیدائش کے بعد ظہور میں آسکا ہے۔ اگر چور دلیری کے ساتھ چوری کرتا ہے

تو انسان کے لئے بڑی دلچسپی کا واقعہ ہے۔ وہ اس کی صورت دیکھنے کے لئے بیقرار ہو جاتا ہے۔ گھنٹوں اس پر رائے زنی کرتا ہے۔ اور وہ تمام اخبار خرید لیتا ہے۔ جس میں اس کی تصویر چھپی ہو۔ یا اس کا تذکرہ کیا گیا ہو۔ لیکن اس واقعہ میں چور کے لئے کیسی شقاوت ہے۔ اور جس مسکین کا مال چوری ہو گیا ہے۔ اس کے لئے کیسی مصیبت ہے۔ اس کے سوچنے کی وہ کبھی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ اگر مکان میں آگ لگ جائے تو انسان کے لئے یہ بڑا ہی دلچسپ نظارہ ہوتا ہے۔ سارا شہر امڈ آتا ہے۔ جس کو دیکھو بے تحاشا دوڑا جاتا ہے اور لوگ اس نظارے کے شوق میں اپنا کھانا پینا تک بھول جاتے ہیں۔ اگر چند انسانوں کے جھلسے ہوئے ڈھانچے آگ کے اندر یعنی شعلوں میں نمودار ہو جائیں۔ اور ان کی چیخیں اتنی بلند ہوں کہ دیکھنے والوں کے کانوں تک پہنچ سکیں تو پھر اس نظارے کی دلچسپی کے اس جہنمی منظر میں اس مکان اور اس کے مکینوں کے لئے کیسی ہلاکت اور تباہی ہے۔ اور جان

وہاں کی کیسی المناک بربادیوں کے بعد آگ اور موت کی یہ ہولناک دل چسپی موجود ہے۔ اس کے سوچنے کی نہ تو لوگوں کو فرصت ملتی ہے، نہ وہ سوچنا چاہتے ہیں اگر انسان کے ابنائے جنس میں سے ایک بدبخت مخلوق کو سولی کے تختے پر لٹکا دیا جائے۔ تو یہ ان تمام نظاروں سے جن کے دیکھنے کا انسان شائق ہو سکتا ہے۔ سب سے زیادہ دلکش منظارہ ہوتا ہے۔ اتنا دلکش نظارہ کہ گھنٹوں کھڑے رہ کر لٹکتی ہوئی لاش دیکھتا رہتا ہے، مگر اس کی سیری نہیں ہوتی۔ لوگ درختوں پر چڑھنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے پر گرنے لگتے ہیں۔ صفیں چیر چیر کر نکل جانا چاہتے ہیں کیوں — ؟ اس لئے کہ اپنے ایک ہم جنس کو جانکنی میں تڑپتے اور پھر ہوا میں معلق جھوتے دیکھ لینے کی لذت حاصل کرلیں۔ لیکن جس انسان کے پھانسی پانے سے انسانی نظارہ کا یہ سب سے زیادہ دلکش نظارہ وجود میں آیا خود اس پر کیا گذری اور وہ کیوں اس منحوس اور شرمناک

موت کا مستحق ٹھہرا۔ ؟ سینکڑوں ہزاروں تماشائیوں میں سے ایک کا ذہن بھی اس غیر ضروری اور غیر دلچسپ پہلو کی طرف نہیں جاتا۔

گرمیوں کا موسم ہے۔ آدھی رات گزر چکی ہے۔ مہینہ کی آخری راتیں ہیں۔ بغداد کے آسمان پر ستاروں کی مجلس آراستہ ہے، مگر چاند کے برآمد ہونے میں ابھی دیر ہے۔ دجلہ کے پار کی تمام آبادی نیند کی خاموشی اور روشنی کی تاریکی میں گم ہے۔ اچانک تاریکی میں ایک متحرک تاریکی نمایاں ہوئی سیاہ لبادے میں ایک لپٹا ہوا آدمی خاموشی اور آہستگی کے ساتھ جا رہا ہے۔ وہ ایک گلی سے مڑ کر دوسری گلی میں پہنچا۔ اور ایک مکان کے سائبان کے نیچے کھڑا ہو گیا اب اس نے سانس لی۔ گویا یہ مدت کی بند سانس تھی۔ جسے اب آزادی سے ابھرنے کی مہلت ملی ہے۔ پھر آسمان کی طرف نظر اٹھائی یقیناً تین پہر رات گزر چکی ہے۔ اب وہ اپنے دل میں کہنے لگا۔ مگر کیا بدنصیبی ہے، کہ جس طرف رُخ کیا

ناکامی ہوئی؟ کیا پوری رات اسی طرح ختم ہو جائے گی یہ
آواز خوفناک ابن ساآباط کی ہے۔ جو دس برس کی طویل زندگی
قید خانے میں بسر کرکے اب کسی طرح نکل بھاگا ہے۔ اور یہ
نکلنے کی پہلی رات ہے۔ اس لئے وقت کے بے نتیجہ ضائع
ہو جانے پر اس کا بے صبری سے پیچ وتاب کھا رہا ہے۔ اس نے
ہر طرف کی آہٹ لی۔ زمین سے کان لگاکر دور دور کی صداؤں
کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر آگے بڑھا۔ کچھ دور آگے چل
کر اس نے دیکھا کہ ایک طرف کی دیواریں دور تک چلی گئی
ہیں۔ اور وسط میں بڑا پھاٹک ہے۔ کرخ کے اس علاقہ میں
زیادہ تر امراء کے باغ تھے۔ یا سوداگروں کا گودام وہ پھاٹک
کے پاس پہنچ کر رک گیا، اور سوچنے لگا، اندر کیونکر جائے
اس نے آہستگی سے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ لیکن اسے
نہایت تعجب ہوا۔ کہ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ صرف
بھیڑا ہوا تھا۔ ایک سیکنڈ نے اندر ابن ساآباط کے قدم
احاطے کے اندر پہنچ گئے۔ اس نے دہلیز سے آگے قدم بڑھایا

تو ایک وسیع احاطہ نظر آیا۔ اس کے مختلف گوشوں میں چھوٹے چھوٹے حجرے بنے تھے۔ اور وسط میں ایک نسبتاً بڑی عمارت تھی۔ یہ درمیانی عمارت کی طرف بڑھا۔ عجیب بات ہے کہ اس کے مختلف گوشوں میں چھوٹے چھوٹے حجرے بنے تھے اور وسط میں حجرۂ "انصاف" کا دروازہ بھی اندر سے بند نہیں تھا۔ چھوتے ہی کھل گیا۔ گویا وہ کسی کی آمد کا منتظر تھا۔ یہ ایک ایسی بے باکی کے ساتھ جو صرف شاق مجرموں کے ہی قدموں میں ہو سکتی ہے۔ اندر چلا گیا۔ اندر جاکر دیکھا تو ایک وسیع ایوان تھا۔ لیکن سامان راحت و زینت میں سے کوئی چیز نہ تھی۔ قیمتی اشیاء کا نام و نشان نہ تھا صرف ایک کھجور کے پتوں کی چٹائی بچھی تھی۔ اور ایک طرف چمڑے کا تکیہ پڑا ہوا تھا۔ البتہ ایک گوشہ میں پشمینہ کے موٹے کپڑے کے بہت سے تھان اس طرح سے بے ترتیب پڑے تھے۔ گویا جلدی میں کسی نے پھینک دیئے ہیں۔ اور ان کے قریب ہی بھیڑ کی کھال کی چند ٹوپیاں بھی پڑی تھیں

اس نے مکان کی موجودات کا پورا جائزہ کچھ تو اپنی اندھیرے میں دیکھ لینے والی آنکھوں سے لیا تھا اور کچھ اپنے ہاتھوں سے ٹٹول کر لیکن اس کا ہاتھ ایک ہی تھا یہ لیٹنے والوں کی بول چال میں ایک ہاتھ کا شیطان تھا جو اب قید و بند کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو گیا تھا۔ دس برس کی قید کے بعد آج ابن سباط کو پہلی مرتبہ موقعہ ملا تھا کہ اپنے پسند کے کام کی جستجو میں آزادی کے ساتھ نکلے جب اس نے دیکھا کہ اس مکان میں کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے اور یہ پہلا قدم بے کار ثابت ہوگا۔ تو اس کے تیز اور بے لگام جذبات سخت مشتعل ہو گئے۔ وہ دل ہی دل میں اس مکان کے رہنے والوں کو گالیاں دینے لگا جو اپنے مکان میں رکھنے کے لئے قیمتی اشیاء فراہم نہ کر سکے۔ ایک مفلس کا افلاس خود اس کے لئے اس قدر درد انگیز نہیں ہوتا جس قدر اس چور کے لئے جو رات کے پچھلے پہر مال و دولت تلاش کرتا ہوا پہنچتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پشمینہ کے بہت

سے تھان یہاں نہ جو تھے۔ اور وہ کتنے ہی موٹے اور اونٰی قسم کے کیوں نہ ہوں۔ مگر پھر اپنی قیمت رکھتے تھے۔ لیکن مشکل یہ بھی کہ ابن سا باط تنہا تھا۔ اور صرف تنہا ہی نہیں تھا۔ بلکہ دو ہاتھوں کی جگہ صرف ایک ہاتھ رکھتا تھا۔ وہ ہزار ہمت کرتا، مگر اتنا بڑا بوجھ اس کے سنبھالے سنبھل نہیں سکتا تھا۔ وہ تھانوں کی موجودگی پر معترض نہ تھا ان کے وزن کی گرانی اور اپنی مجبوری پر متاسف تھا۔

آخر وزنی جیسے چرا کرلے جانا آسان نہ تھا؟

"ایکبزار لعنت کرخ اور اس کے باشندوں پر" وہ اندر ہی اندر بڑبڑانے لگا۔ "نہیں معلوم کون احمق ہے جس نے یہ ملعون تھان جمع کر رکھے ہیں۔ غالباً کوئی تاجر ہے لیکن عجیب طرح کا تاجر ہے۔ جسے بغداد میں تجارت کرنے کے لئے اور کوئی چیز نہیں ملی۔ اتنا بڑا مکان بنا کر اس میں گدھوں اور خچروں کی جھول بنانے کا سامان جمع کر دیا ہے۔" اس نے اپنے ایک ہی ہاتھ سے ایک تھان ٹٹول ٹٹول کر پیمائش کی

"بھلا یہ ملعون بوجھ کس طرح اٹھایا جا سکتا ہے۔ ایک تھان کے اٹھانے کے لئے گن کر دس گدھے ساتھ لانے چاہئیں لیکن بہرحال کچھ کرنا ضروری ہے"۔

رات جا رہی تھی اور اب وقت نہ تھا کہ دوسری جگہ تاکی جاتی۔ اس نے جلدی سے ایک تھان کھولا اسے فرش پر بچھا دیا۔ پھر کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ تھان جو اٹھائے جا سکتے ہیں اٹھالے۔ مشکل یہ تھی۔ کہ جس مال کی قیمت زیادہ تھی وہ بہت زیادہ وزنی تھا۔

کم لیتا تو بیکار تھا۔ زیادہ لیتا ہے تو لے جا نہیں سکتا۔ عجیب طرح کی کشمکش میں گرفتار تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح یہ مرحلہ طے ہوا۔ لیکن اب دوسری مشکل پیش آئی۔ صوف کا کپڑا بیحد موٹا تھا۔ اسے مروڑ دے کر گرہ لگانا آسان نہ تھا۔ دونوں ہاتھوں سے بھی یہ کام مشکل تھا۔ چہ جائیکہ ایک ہاتھ سے؟ بلاشبہ اس کے پاس ہاتھ کی طرح پاؤں ایک نہ تھا، دو تھے۔ لیکن وہ بھلا گئے میں مدد دے سکتے ہیں

صورت کی گھڑی باندھنے کے لئے سود مند نہ تھے۔ اس نے بہت سی تجویزیں سوچیں طرح طرح کے تجربے کئے۔ دانتوں سے کام لیا۔ کٹی ہوئی کھچی سے سہارا دیا۔ لیکن کسی طرح بھی گٹھری میں گرہ نہ لگ سکی۔ وقت کی مصیبتوں۔ بس نا کامی کی شدت نے اور زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔ اندرونی جذبات کے ہیجان اور بیرونی فعل کی بیسود محنت نے ابن سا باط کو بہت تھکا دیا وقت کے کسی عمل کا قدرتی خون مال کی گرانی محنت کی شدت اور فائدہ کی قلت اس کے دماغ کے تمام مخالف تاثرات جمع ہو گئے تھے۔ اچانک وہ چونک اٹھا۔ اس کی تیز قوت سماعت نے کسی کے قدموں کی نرم آہٹ محسوس کی۔ ایک لمحہ تک خاموشی رہی۔ پھر ایسا محسوس ہوا۔ جیسے کوئی آدمی دروازے کے پاس کھڑا ہے۔ ابن سا باط گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر قبل اس کے کہ وہ کوئی حرکت کر سکے، دروازہ کھلا اور روشنی نمایاں ہوئی۔ خوف اور دہشت سے اس کا خون منجمد ہو گیا۔ جہاں کھڑا تھا۔ وہیں قدم گڑ گئے۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے ایک

شخص کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں شمع دان ہے۔ اور اسے اس طرح اونچا کر رکھا ہے کہ کمرے کے تمام حصے روشن ہو گئے۔ اس شخص کی وضع قطع سے اس کی شخصیت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ ملگجے رنگ کی ایک لمبی عبا اس کے جسم پر تھی جسے کمر کے پاس ایک موٹی رسی سے لپیٹ کر جسم پر چست کر لیا تھا۔ سر پر سیاہ اونچی دیوار کی ٹوپی تھی۔ اور اس قدر کشادہ تھی۔ کہ اس کے کنارے ابروؤں کے قریب تک پہنچ گئے تھے جسم نہایت نحیف تھا۔ اتنا نحیف کہ صوف کی ٹوپی بجائے پر بھی اندر دھکے۔ ابھری ہوئی ہڈیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اور قد کی دلدزی سے جسم میں کمر کے پاس خفیف سی خمیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن یہ عجیب بات تھی۔ کہ جسم کی اس معمولی طاقت کا کوئی اثر اس کے چہرے پر نظر نہیں آتا تھا۔ اتنا کمزور جسم رکھنے پر بھی اس کا چہرہ کچھ عجیب طرح کی تاثیر و گہرائی رکھتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہڈیوں کے ڈھانچہ پر ایک شاندار وَل آویز چہرہ جوڑ دیا گیا ہے،

رنگت زرد تھی۔ رخسار بے گوشت تھے۔ جسمانی تنومندی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ لیکن پھر بھی جبری کی مجموعی ہیئت میں کوئی ایسی چیز تھی کہ دیکھنے والا محسوس کرتا تھا کہ ایک نہایت طاقت ور چہرہ اس کے سامنے ہے۔ خصوصاً اس کی نگاہیں روشن اور ایسی ساکن تھیں۔ کہ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی ساری راحت اور سکون ان ہی دو حلقوں کے اندر سما گئی ہے۔ چند لمحوں تک یہ شخص اُونچی شمع کئے ہوئے ابن سا آباد کو دیکھتا رہا پھر اس طرح آگے بڑھا گویا اسے جو کچھ سمجھنا تھا سمجھ چکا ہے اس کے چہرے پر ہلکا سا زیر لب تبسّم تھا۔ ایک ایسا دل آویز اور شیریں تبسّم جس کی موجودگی انسانی روح کے سارے اضطراب اور خوف دور کر سکتی ہے۔ اس نے شمع دان ایک طرف رکھ دیا اور ایک ایسی آواز میں جو شفقت و ہمدردی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ابن سا آباد سے کہا "میرے دوست! تم پر خدا کی سلامتی ہو۔ جو کام تم کرنا چاہتے ہو۔ وہ بغیر روشنی اور ایک رفیق کے انجام نہیں پا سکتا۔ دیکھو یہ شمع دان روشن ہے

اور میں تمہاری رفاقت کے لئے موجود ہوں۔ روشنی میں ہم دونوں اطمینان اور سہولت کیساتھ یہ کام انجام دے لیں گے"

وہ ایک لمحے کے لئے رکا جیسے کچھ سوچنے لگا ہو۔ پھر اس نے کہا" مگر میں دیکھتا ہوں تم بہت تھک گئے ہو۔ تمہاری پیشانی پسینے سے تر ہو رہی ہے۔ یہ گرم موسم یہ بند کمرہ جس میں تاریکی ہی تاریکی اور تاریکی میں ایسی سخت محنت افسوس! انسان کو اپنے رزق کے لئے کیسی کیسی زحمتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں دیکھو یہ چٹائی بچھی ہے، یہ چمڑے کا تکیہ ہے میں اسے دیوار کے ساتھ لگا دیتا ہوں"۔

اس نے تکیہ دیوار کے ساتھ لگا کر رکھ دیا اور کہا۔

" بس ٹھیک ہے۔ اب تم اطمینان کے ساتھ یہاں ٹیک لگا کر بیٹھ جاؤ اور اچھی طرح سستا لو۔ اتنی دیر میں میں تمہارا ادھورا کام پورا کئے دیتا ہوں۔" اس نے یہ کہا۔ اور ابن ساباط کے کاندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر اسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ پھر جب اس کی نظر دوبارہ اس کی عرق آلود پیشانی

پھر پڑی تو اس نے کمر سے رومال کھولا اور اس کی پیشانی کا پسینہ پونچھ ڈالا۔

جب وہ پسینہ پونچھ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں باپ کی سی شفقت اور ہاتھوں میں بھائی کی سی محنت کام کر رہی تھی صورت حال کے یہ تمام تغیرات اس تیزی سے ظہور میں آئے کہ ابن سباباط کا دماغ معطل ہو کر رہ گیا۔ اور وہ کچھ سمجھ نہ سکا کہ کیا معاملہ ہے۔ ایک مدہوش اور بے ارادہ آدمی کی طرح اس نے اجنبی کے اشارے کی تعمیل کی، اور وہ چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اب اس نے دیکھا کہ واقعی اجنبی نے کام شروع کر دیا اس نے پہلے وہ گٹھڑی کھولی جو ابن سباباط نے باندھنی چاہی تھی۔ مگر بندھ نہیں سکی تھی۔ پھر دونوں تھان کھول کر بچھا دیئے۔ اور جس قدر بھی تھان موجود تھے ان سب کو دو حصوں میں منقسم کر دیا۔ ایک حصے میں زیادہ تھے اور دوسرے حصے میں کم۔ پھر دونوں کی الگ الگ دو گٹھریاں باندھیں۔ یہ تمام کام اس نے ایسے اطمینان اور سکون کے

ساتھ کیا، گویا اس کے لئے کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ پھر اچانک اُسے کچھ خیال آیا اس نے اپنی عبا اتار ڈالی اور اسے بھی گٹھڑی کے اندر رکھ دیا۔ اب وہ اٹھا اور ابنِ سا باط کے قریب گیا۔

" تمہارے چہرے کی پژمردگی سے معلوم ہوتا ہے، کہ تم صرف تھکے ہوئے نہیں ہو، بلکہ بھوکے بھی ہو۔ بہتر ہو گا کہ چلنے سے پہلے دودھ کا ایک پیالہ پی لو۔ اگر تم چند لمحے انتظار کرسکو تو میں دودھ لے آؤں گا" اس نے کہا۔

اس کے چہرے پر بدستور مسکراہٹ کی دل آویزی موجود۔۔۔ یکن یہ تھا کہ اس مسکراہٹ سے انسانی قلب کے تمام اضطراب نہ ہو جائیں۔ قبل اس کے کہ ابنِ سا باط جواب دے وہ تیزی کے ساتھ لوٹا اور باہر نکل گیا۔

اب ابنِ سا باط تنہا تھا۔ لیکن تنہا ہونے پر بھی اس کے قدموں میں حرکت نہ ہوئی۔ اجنبی کے طرزِ عمل میں کوئی بات ایسی نہ تھی، جس سے اس کے اندر خوف پیدا ہوتا۔ وہ صرف

متحیّر اور مبہوت تھا۔

اجنبی کی ہستی اور اس کا طور طریقہ ایسا عجیب غریب تھا کہ جب تک وہ موجود رہا ابن سا باط کو نخیرہ نا ثرنے سوچنے سمجھنے کی مہلت نہ دی۔ اجنبی کی شخصیت کی تاثیر سے اس کا دماغ اصلی حالت پر واپس آنے لگا۔ یہاں تک کہ دماغ کے خصائل پوری طرح ابھر آئے۔ اور وہ اسی روشنی میں معاملات کو دیکھنے لگا جس روشنی میں دیکھنے کا ہمیشہ سے عادی تھا۔ وہ جب اجنبی کا تبسم سے پُر چہرہ اور دل نواز باتیں یاد کرتا۔ تو شک اور خوف کی جگہ اس کے اندر ایک ناقابل فہم جذبہ پیدا ہو جاتا۔ جو آج تک اسے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا لیکن پھر جب وہ سوچتا کہ اس معاملہ کا مطلب کیا ہے۔ اور یہ شخص کون ہے۔ تو اس کی عقل حیران رہ جاتی۔ اور کوئی بات سمجھ میں نہ آتی۔ اس نے اپنے دل میں کہا۔ یہ تو قطعی ہے کہ چوروں کا اس طرح استقبال نہیں کرتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مگر پھر یہ شخص کون تھا۔ ؟

اچانک ایک نیا خیال اس کے اندر پیدا ہوا۔ اور وہ ہنسا استغفراللہ میں بھی کیا احمق ہوں۔ یہ بھی کوئی سوچنے اور حیران ہونے کی بات تھی۔ ؟

یقیناً یہ بھی کوئی میرا ہم پیشہ ہی ہے۔ اور اسی نواح میں رہتا ہے۔ اتفاقات نے آج ہم دونوں چوروں کو ایک ہی مکان میں جمع کر دیا۔ چونکہ یہ اسی نواح کا آدمی ہے، اس لئے اس مکان کے تمام حالات سے واقف ہوگا کہ مکان آج رہنے والوں سے خالی ہے۔ اور باطمینان کام کرنے کا موقع ہے اس لئے وہ روشنی کا سامان ساتھ لے کر آیا۔ لیکن جب دیکھا کہ میں پہلے سے پہنچا ہوا ہوں، تو آمادہ ہو گیا، کہ میرا ساتھ دے کر ایک حصّہ کا حقدار بن جائے . . . .

وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا۔ کہ دروازہ کھلا۔ اور اجنبی لکڑی کا ایک بڑا پیالہ لئے نمودار ہوا۔ " یہ تو تمہارے لئے دودھ لے آیا ہوں لے پی لو۔ یہ بھوک اور پیاس دونوں کے لئے مفید ہوگا۔" یہ کہہ کر اس نے پیالہ ابن ساباط کو پکڑا دیا۔ ابن ساباط

واقعی بھوکا پیاسا تھا۔ بلا تامل منہ کو لگا یا۔ اور ایک ہی سانس میں پی گیا۔ اب اس معاملہ کی فکر ہوئی۔ آتی دیر میں دودھ نے اس کی طبیعت بحال کر دی تھی۔

"دیکھو اگرچہ میں تم سے پہلے یہاں پہنچ چکا تھا۔ اور ہاتھ لگا چکا تھا۔ اور اس لئے ہم لوگوں کے قاعدے کے بموجب تمہارا کوئی حق نہیں لیکن تمہاری ہوشیاری اور مستعدی دیکھنے کے بعد مجھے کوئی تامل نہیں کہ تمہیں اس مال میں شریک کروں۔ اگر تم پسند کرو گے تو ہمیشہ کے لئے تم سے معاملہ کروں گا۔ لیکن دیکھو میں کہے دیتا ہوں کہ آج کا کام دراصل میرا ہی کام تھا"۔ اس نے صاف آواز میں کہا۔ اس کی آواز میں اب تاثر نہیں حکم تھا۔ لیکن اس کے علاوہ بھی اس میں کوئی چیز تھی۔ لیکن ابن سا باط سمجھ نہ سکا۔ اس نے خیال کیا۔ شاید یہ شخص اس طریق تقسیم پر تیار نہیں اچانک اس کی آنکھیں اس کی خوفناک مجرمانہ درندگی سے چمک اٹھیں وہ غصہ سے مضطرب

ہو کر کھڑا ہو گیا۔ "بے وقوف، چپ کیوں ہے۔ ؟ یہ سمجھنا کہ دودھ کا ایک پیالہ پلا کر اور چکنی چپڑی باتیں کرکے تم مجھے احمق بنالوگے۔ تم نہیں جانتے میں کون ہوں مجھے کوئی احمق نہیں بنا سکتا۔ میں ساری دنیا کو احمق بنا چکا ہوں۔ بولو ! اس پر راضی ہو یا نہیں اگر نہیں ہو تو . . . ."

لیکن ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی۔ کہ جبنی کے لب متحرک ہوئے۔ اب بھی اس کے لبوں سے اس کی مسکراہٹ نہیں ہٹی تھی۔

" میرے عزیز دوست کیوں بلا وجہ اپنی طبیعت آزردہ کرتے ہو۔ ؟ آؤ یہ کام جلد نپٹالیں جو ہمارے سامنے ہے۔ دیکھو میں نے دو گٹھریاں باندھ لی ہیں۔ ایک چھوٹی ہے ایک بڑی ہے۔ تمہارا ایک ہی ہاتھ ہے۔ اس لئے تم زیادہ بوجھ نہیں سنبھال سکتے لیکن میں دونوں ہاتھوں سے سنبھال لوں گا۔ چھوٹی گٹھری تم اٹھالو میں بڑی اٹھالیتا ہوں۔ باقی رہا میرا حصہ جس کے خیال سے

تمہیں اتنی آنزر دگی ہوئی تو میں بھی نہیں چاہتا کہ اِسی وقت اِس کا فیصلہ کراؤں۔ تم نے کہا ہے کہ تم ہمیشہ کے لئے مجھ سے معاملہ کر سکتے ہو۔ مجھے بھی ایسا ہی معاملہ پسند ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ہمیشہ کے لئے مجھ سے معاملہ کر لو۔'

'ہاں اگر یہ بات ہے۔ تو پھر سب کچھ ٹھیک ہے تمہیں ابھی معلوم نہیں میں کون ہوں پورے ملک میں تمہیں مجھ سے بہتر کوئی سر دار نہیں مل سکتا۔' اس نے بڑی گٹھڑی کے اٹھانے میں اجنبی کو مدد دیتے ہوئے کہا یہ گٹھڑی اس قدر بھاری تھی کہ ابن سباآط اپنی حیرانی نہ چھپا سکا۔ وہ اگرچہ اپنے رفیق کی زیادہ جرأت افزائی کرنا پسند نہیں کرتا تھا پھر بھی اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

'دوست تم دیکھنے میں تو بڑے دُبلے پتلے ہو۔ لیکن بوجھ اٹھانے میں بڑے مضبوط نکلے۔' ساتھ ہی اس نے اپنے دل میں کہا یہ جتنا مضبوط ہے۔ اتنا عقلمند نہیں ہے۔ ورنہ اپنے

حصہ سے دستبردار نہ ہوتا۔ اگر آج یہ احمق نہ بل جاتا۔ تو مجھے سارا مال چھوڑ کر صرف ایک دو دھقان پر ہی قناعت کرلینی پڑتی۔

اب ابن ساباط نے اپنی گٹھری اٹھائی جو بہت ہلکی تھی اور دونوں باہر نکلے اجنبی کی پیٹھ جس میں پہلے سے خم موجود تھا اب گٹھری کے ایک دو دھقان کے وزن سے بالکل جھک گئی تھی رات کی تاریکی میں اتنا بھاری بوجھ اٹھا کر چلنا نہایت دشوار تھا لیکن ابن ساباط کو قدرتی طور پر جلدی تھی۔ وہ بار بار حاکمانہ انداز سے اصرار کرتا۔ کہ تیز چلو اور چونکہ خود اس کا بوجھ بہت ہلکا تھا۔ اس لئے خود تیز چلنے میں کسی طرح کی دشواری محسوس نہیں کرتا تھا۔ اجنبی تعمیل حکم کی پوری کوشش کرتا۔ لیکن بھاری بوجھ اٹھا کر دوڑنا انسانی طاقت سے باہر تھا۔ اس لئے پوری طاقت صرف کرنے پر بھی زیادہ تیز نہیں چل سکتا تھا۔ کئی مرتبہ ٹھوکریں لگیں۔ بار بار بوجھ گرتے گرتے رہ گیا۔ ایک مرتبہ اتنی سخت چوٹ کھائی قریب

تھا کہ گر جائے پھر بھی اس نے رُکنے یا سستانے کا نام
نہیں لیا۔ گرتا پڑتا اپنے ساتھی کے ساتھ بڑھتا ہی رہا۔
لیکن ابن سا باط اس پر بھی خوش نہ تھا۔ اس نے
پہلے تو ایک دو مرتبہ چلنے کا حکم دیا۔ اور پھر بے تحاشا گالیوں
پر اتر آیا۔ ہر لمحہ کے بعد ایک سخت گالی دیتا۔ اور کہتا تیز
چلو۔ اتنے میں پل آیا یہاں چڑھائی تھی۔ جسم کمزور اور تھکا
ہوا بوجھ بے حد بھاری، اجنبی سنبھل نہ سکا۔ اور بے اختیار
گر پڑا۔ ابھی وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ اوپر
سے ایک سخت لات پڑی۔ یہ ابن سا باط کی لات تھی اس
نے غضبناک ہو کر کہا۔ "کتے کے بچے اگر اتنا بوجھ سنبھال نہیں
سکتا تھا تو لاد کر کیوں لایا" اجنبی ہانپتا ہوا اٹھا اس کے
چہرے پر درد و شکایت کی جگہ شرمندگی کے آثار پائے جاتے
تھے۔ اس نے فوراً گٹھری اٹھائی اور پیٹھ پر رکھی۔ اور پھر
روانہ ہو گیا۔ اب یہ دونوں شہر کے کنارے ایک ایسے حصّے میں
پہنچ گئے۔ جو بہت کم آباد تھا۔ ابن سا باط اس احاطہ کے ایک

جانب پہنچ کر رک گیا۔ اور اجنبی سے کہا۔ "یہیں بوجھ اتار دو"
پھر کود کر اندر چلا گیا۔ اور اجنبی نے باہر سے دونوں گٹھریاں
اندر پھینکدیں۔ اس کے بعد اجنبی بھی کود کر اندر چلا گیا۔ اور وہ
دونوں عمارت کے اندرونی حصے میں پہنچ گئے۔ اس عمارت کے
نیچے ایک پرانا تہہ خانہ تھا۔ وہ وہاں نہیں جانا چاہتا تھا کہ اجنبی
پر ابھی اس درجہ اعتماد کرے، کہ اپنا اصلی محفوظ مقام دکھائے۔
جس جگہ یہ دونوں کھڑے تھے، دراصل ایک ناتمام ایوان تھا یا
تو اس پر پوری چھت ہی نہ تھی یا۔۔۔ تھی تو امتداد وقت سے شکستہ
ہوکر گر پڑی تھی۔ ایک طرف بہت سے پتھروں کا ڈھیر تھا ابن
ساباط انہیں پتھروں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ دونوں گٹھریاں
سامنے دھری تھیں۔ ایک گوشہ میں اجنبی کھڑا کانپ رہا تھا۔ کچھ
دیر تک خاموشی رہی۔ یکایک اجنبی بڑھا۔ اور ابن ساباط کے سامنے
آکر کھڑا ہو گیا۔ اب رات ختم ہونے پر تھی پچھلے پہر کا چاند درخشندہ
تھا۔ کھلی چھت سے اس کی طلعت آلودہ شعاعیں ایوان کے اندر
پہنچ رہی تھیں ابن ساباط دیوار کے سائے میں تھا لیکن اجنبی جو

اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ ٹھیک چاند کے مقابل تھا۔ اس لئے اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا ابنِ ساباط نے دیکھا کہ تاریکی میں ایک درخشاں چہرہ ایک نورانی تبسم ایک پُراسرار انداز نگاہ کی دل آویزی کے ساتھ ہے۔

"میرے عزیز دوست اور رفیق" اجنبی نے اس دلنواز اور شیریں آواز میں جو دو گھنٹہ پہلے ابن ساباط کو بے خود کر چکی تھی۔ کہنا شروع کیا۔

"میں نے اپنی خدمت پوری کر لی ہے۔ اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ اس کام کے کرنے میں مجھ سے کمزوری اور سستی ظاہر ہوئی اور اس کی وجہ سے بار بار تمہیں پریشان خاطر ہونا پڑا، اس کے لئے میں بہت شرمندہ ہوں، اور تم سے معافی چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے تم مجھے معاف کر دوگے اس دنیا میں ہماری کوئی بھی بات خدا کے کاموں سے اس قدر ملتی جلتی نہیں۔ جس قدر یہ بات کہ ہم ایک دوسرے کو معاف کر دیں اور بخش دیں۔ لیکن قبل اس کے کہ میں تم سے الگ ہوں

میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں ہیں وہ نہیں ہوں جو تم نے میرے کمرے میں خیال کیا ہے۔ میں اس مکان میں رہتا ہوں جہاں آج تم سے ملاقات ہوئی، اور تم نے میری رفاقت قبول کر لی تھی۔ میری عادت ہے کہ رات کو تھوڑی دیر کے لئے اس کمرے میں جایا کرتا ہوں، جہاں تم بیٹھے تھے۔ آج آیا تو دیکھا تم اندھیرے میں بیٹھے ہو، اور تکلیف اٹھا رہے ہو۔ تم میرے گھر میں عزیز مہمان تھے۔ افسوس میں آج اطلاع سے تمہاری تواضع اور خدمت نہ کر سکا۔ تم نے میرا مکان دیکھ لیا ہے آئندہ جب کبھی تمہیں ضرورت ہو تم بلا تکلف اپنے رفیق کے پاس آسکتے ہو۔ خدا کی سلامتی اور برکت ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے" یہ کہا اور آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مصافحہ کیا، اور تیزی کے ساتھ نکل کر روانہ ہو گیا۔

اجنبی خود تو روانہ ہو گیا۔ لیکن ابن سبا آباد کو ایک اور ہی عالم میں پہنچا گیا۔ اب وہ مبہوت اور مدہوش تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں وہ اسی طرف تک رہا تھا۔ جس طرف اجنبی

روانہ ہوا تھا۔ لیکن معلوم نہیں اسے کچھ سجھائی بھی دیتا تھا یا نہیں

—— ۶ ——

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ بغداد کی مسجدوں سے جوق درجوق نمازی نکل رہے تھے۔ دوپہر کی گرمی نے امیروں کو تہ خانوں میں اور غریبوں کو دیواروں کے سائے میں بٹھا دیا تھا۔ اب دونوں نکل رہے ہیں۔ ایک تفریح کے لئے دوسرا مزدوری کیلئے۔ لیکن ابن ساباط اس وقت تک وہیں بیٹھا ہے جہاں صبح بیٹھا تھا۔ رات والی دونوں گٹھڑ یاں سامنے پڑی ہیں۔ اور اس کی نظریں اسی طرح گڑی ہیں۔ مثلاً ان کی سلوٹوں کے اندر اپنے رات والے رفیق کو ڈھونڈ رہا ہے۔ بارہ گھنٹے گذرے لیکن جسم اور زندگی کی کوئی ضرورت بھی اسے محسوس نہیں ہوئی۔ وہ بھوک جس کی خاطر اس نے اپنا ایک ہاتھ کٹوا دیا تھا۔ اب اسے نہیں ستاتی اور وہ خوف جس کی وجہ سے سورج کی روشنی اس کے لئے دنیا کی سب سے زیادہ نفرت انگیز چیز ہوگئی تھی۔ اب اسے محسوس نہیں ہوتی اور وہ رات والے عجیب و غریب اجنبی کی صورت خود تو اس کی

نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ مگر اسے ایک ایسے عالم کی جھلک دکھلا گئی۔ جو اب تک اس کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ اس کی ساری زندگی گناہ اور سیہ کاری میں بسر ہوئی تھی۔ اس نے انسانوں کی نسبت جو کچھ دیکھا سنا تھا۔ وہ یہی تھا۔ کہ خود غرضی کا پتلا اور نفس پرستی کی مخلوق ہے۔ وہ نفرت سے منہ پھیر لیتا ہے۔ بے رحمی سے ٹھکرا دیتا ہے۔ سخت سے سخت سزائیں دیتا ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا۔ کہ محبت بھی کرتا ہے۔ اور اس میں فیاضی بخشش اور قربانی کی روح بھی ہو سکتی ہے۔ بچپن میں اس نے بھی خدا کا نام سنا تھا۔ اور لوگوں کو خدا پرستی کرتے دیکھا تھا۔ لیکن جب زندگی کی کش کش کا میدان سامنے کھلا تو اس کا عالم ہی دوسرا تھا۔ نہ تو خود اسے کبھی مہلت ملی کہ خدا پرستی کی طرف متوجہ ہوتا۔ اور نہ انسانوں نے کبھی اس کی ضرورت محسوس کی کہ اسے خدا آشنا کرتے ۔۔۔ جوں جوں اس کی شقاوت بڑھتی گئی سوسائٹی اپنی سزا و عقوبت کی مقدار بڑھاتی گئی سوسائٹی کے پاس اس کی شقاوت کے لئے بے رحمی تھی۔ اس لئے یہ بھی دنیا

کی ساری چیزوں میں سے صرف بے رحمی ہی کو جانتا تھا لیکن
اب اچانک اس کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ آسمان کے سورج
کی طرح محبت کا بھی ایک سورج ہے۔ یہ جب چمکتا ہے تو روح
اور دل کی ساری تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں۔ اب یکایک اس
سورج کی پہلی کرن ابن سباط کے دل کے تاریک گوشوں پر
پڑی اور بیک وقت دفعتہ تاریکی سے نکل کر ابن سباط روشنی
میں آگیا۔

اجنبی کی شخصیت اپنی پہلی نظر میں اس کے دل تک پہنچ
چکی تھی۔ لیکن وہ جہالت میں گم رہی، وہ اس کا مقابلہ کرتا رہا
اور حقیقت کے فہم کے لئے تیار نہیں ہوا۔ لیکن جونہی اجنبی
کے آخری الفاظ نے وہ پردہ ہٹا دیا، جو اس نے اپنی آنکھوں
پر ڈال لیا تھا۔ حقیقت اپنی پوری عاشقانہ تاثیر کے ساتھ
بے نقاب ہو گئی۔ اور اب اس کی طاقت سے باہر تھا کہ اس
تیر کے زخم سے سینہ بچائے جاتا۔ اس نے اپنی جہالت سے
پہلے خیال کیا تھا کہ اجنبی بھی میری طرح ایک چور ہے۔ وہ

اپنا حصہ لینے کے لئے میری رفاقت واعانت کر رہا ہے۔ اس کا ذہن یہ تصور ہی نہیں کرسکتا تھا کہ بغیر غرض کے ایک انسان دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کرسکتا ہے۔ لیکن جب اجنبی نے چلتے وقت بتلایا کہ وہ چور نہیں، بلکہ اسی مکان کا مالک ہے جس مکان کا مالک کا مال ومتاع غارت کرنے کے لئے وہ گیا تھا، تو اسے یہ محسوس ہوا کہ جیسے یکایک بجلی آسمان سے گر پڑی۔

یہ چور نہیں ہے۔ مکان کا مالک تھا۔ لیکن اس نے چور کو پکڑنے اور سزا دلانے کی جگہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اس سلوک کا جواب اس کی روح کے لئے ناسور اور اس کے دل کے لئے ایک دہکتا ہوا انگارہ تھا۔ وہ جس قدر سوچتا روح کا زخم گہرا ہوتا جاتا۔ اور ہر بات کی یاد کے ساتھ ایک تازہ زخم کی چبھن محسوس کرتا۔ جب ایکرنبہ حافظہ میں یہ سرگذشت ختم ہو جاتی۔ تو پھر نئے سرے سے یاد کرنا شروع کر دیتا۔ اور آخر تک پہنچ کر ابتداء کی طرف لوٹتا میں اس کے ہاں چوری کرنے کے لئے گیا تھا، اور آخر تک میں نے اسے بھی چور سمجھا لے

گالیاں دیں۔ بے رحمی سے ٹھوکر لگائی مگر اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ہر مرتبہ اس آخری سوال کا جواب سوچتا اور پھر یہی سوال دہرانے لگتا۔ سورج ڈوب رہا ہے۔ بغداد کی مسجدوں کے میناروں پر مغرب کی اذان کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں ابن ساباط بھی اپنے پُر آباد گوشے سے اٹھا چادر جسم پر ڈالی اور بغیر کسی جھجک کے باہر نکل گیا۔ اب اس کے دل میں خوف نہیں تھا کیوں کہ خوف کی جگہ ایک دوسرے ہی جذبہ نے لے لی تھی

وہ کرخ کے اس حصّہ میں پہنچا۔ جہاں رات گیا تھا جہاں رات والے مکان کے پہچاننے میں اسے کوئی دقت پیش نہیں آئی مکان کے قریب ایک لکڑہارے کا جھونپڑا تھا۔ یہ اس کے پاس گیا۔ اور پوچھا "یہ جو سامنے بڑا سا احاطہ ہے۔ اس میں کوئی تاجر رہتا ہے۔۔ ؟"

"تاجر!" بوڑھے لکڑہارے نے تعجب کے ساتھ کہا "معلوم ہوتا ہے۔ تم یہاں کے رہنے والے نہیں ہو۔ یہاں تاجر کہاں سے آیا۔ یہاں تو شیخ جنید بغدادی رہتے ہیں۔"

ابن ساباط اس نام کی شہرت سے بے خبر نہ تھا۔ لیکن صورت آشنا نہ تھا۔ ابن ساباط مکان کی طرف چلا رات کی طرح اس وقت بھی دروازہ کھلا تھا۔ یہ بے تامل اندر چلا گیا۔ سامنے دری رات والا ایوان تھا آہستہ آہستہ بڑھا۔ اور دروازے کے اندر نگاہ ڈالی وہ رات والی چٹائی بھی تھی، رات والا تکیہ ایک جانب دھرا تھا۔ تکیہ سے سہارا لگائے عجیب اجنبی بیٹھا تھا۔ تیس چالیس آدمی سامنے تھے۔ واقعی تاجر نہیں تھا شیخ جنید بغدادی تھے۔ اتنے میں عشاء کی اذان ہوگئی۔ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے جب سب لوگ جاچکے تو شیخ بھی اٹھے جوں ہی انہوں نے دروازے کے باہر قدم رکھا ایک شخص بے تابانہ بڑھا۔ اور قدموں پر گر گیا۔ یہ ابن ساباط تھا۔ دجلہ کی موجیں ٹھہر گئی تھیں۔ دیر تک رکی رہیں۔ مگر اب نہیں رک سکتی تھیں جب آنسوؤں کا سیلاب آجائے تو پھر دل کی کونسی کثافت ہے جو باقی رہ سکتی ہے۔ شیخ نے شفقت سے اس کا سر اٹھایا یہ کھڑا ہو گیا۔ مگر زبان نہ کھل سکی۔ اور اب اس کی ضرورت بھی

کیا بھی جب نگاہوں کی زبان کھل جاتی ہے۔ تو منہ کی زبان کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اس واقعہ پر کچھ عرصہ گذر چکا ہے۔ شیخ احمد بن ساباط کا شمار سید الطائفہ کے حلقہ ارادت کے ان فقراء میں ہے۔ جو سب میں پیش پیش ہیں شیخ کہا کرتے ہیں۔ ابن ساباط نے وہ راہ لمحوں میں طے کر لی۔ جو دوسرے برسوں میں بھی طے نہیں کر سکتے۔

ابنِ ساباط کو ۴۰ برس تک دنیا کی دہشت انگیز سزائیں نہ ہلا سکیں مگر جذبۂ قربانی کے ایک لمحہ نے چور سے اہل اللہ بنا دیا۔

(الہلال سنہ ۱۹۲۷ء)

قمار باز

طامس ایک سنگدل قمار باز رات کو گھر سے نکلا جس طرح قطب نما کی سوئی ہمیشہ قطب کی طرف رہتی ہے۔ اسی طرح قمار باز کا دل بھی قمار خانہ سے ہٹ نہیں سکتا۔ لیکن عین اسی وقت اس گھر میں ایک اور دل بھی تھا جس کی محبت کی سوئی بالکل اسی طرح طامس کے ہر دل کی طرف پھری رہتی تھی۔ اس کی بیوی نے اپنے شیر خوار بچے کی طرف دیکھا، جس کو صبح سے دودھ کا ایک قطرہ نصیب نہیں ہوا تھا کیونکہ خود اس کی ماں پر فاقہ کی دو شامیں گذر چکی تھیں۔ وہ بلک رہا تھا۔ لیکن اس نے جلدی اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور ان پر آب آنکھوں سے جن میں حسرت و مایوسی کے آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ طامس کی طرف دیکھا۔

آہ! عورت کی نظر جبکہ اس مایوسی میں ہو آہ فطرت عالم کی حکمراں جبیل جبکی

نگاہ ہر امیدوں اور مایوسی کی بخشش گاہ ہے۔ کون دیکھ سکتا ہے۔ کہ خود کسی نگاہ سے رحم و طلب کی طالب ہو۔ لیکن طامس نے اسکی نگاہ امید طلب اور اشک دادخواہ کی حقارت کی اس بے پروائی سے اسے ٹھکرا دیا۔ وہ سوچنے لگی کہ یہی بے مہر اشک محبت سے ناآشنا آنکھیں تھیں۔ جنہوں نے اب سے پانچ سال پہلے ایک ایسی رات میں اپنے اشک ہائے محبت سے میرا دامن تر کر دیا تھا۔ اس نے مجھ سے محبت کی تھی۔ لیکن آج میں اس سے رحم کی طالب ہوں۔ وہ قمار خانہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ کاش وہ کسی طرف دیکھ سکتا۔ کہ یاس و حسرت کی نگاہیں کس طرح اس کا تعاقب کر رہی ہیں۔ وہ عشق قمار سے بیخود تھا۔ کاش اسے یاد آتا کہ ایک دل ہے جو اسی کی طرح قمار محبت میں بازی ہار چکا ہے۔ اور اب فتحیاب دشمن کے قبضہ میں ہے۔ صبح کو وہ اٹھی اور بچے کو گود میں لیا اور قمار خانہ میں آکر اپنے گم گشتہ کو تلاش کیا اس کا سر چکرا رہا تھا مگر اس کو سننا پڑا کہ رات کو پولیس کا ایک گروہ اسکے شوہر کو گرفتار کر کے لیگیا ہے اب اسکی آنکھیں خشک تھیں سفر حیات کی ایک خاص منزل آنسوؤں کی بھی تھی مگر وہ اس سے گذر چکی تھی۔ وہ راستہ پوچھتے ہوئے قید خانہ کے دروازے پر پہنچی بچہ گود میں تھا۔ ڈھونڈنے لگی کون کہہ سکتا ہے۔ کہ اس وقت اس کے دل میں کیا کیا خیالات گذر رہے تھے۔ عورت کے دل کو اس گنج مخفی اس طلسم جمیل اس عقدہ حسین کے دل کو دنیا میں کون سمجھ سکتا ہے۔

مقدس فرض

یکم مئی ۱۸۰۹ء میں نپولین آسٹریا میں جنگ کر رہا تھا۔ ۲۳ر اکتوبر کو جب وہ اپنی فتح مند فوجوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ یکایک میدان کے ایک گوشے سے ایک خوبصورت نوجوان نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ نپولین کی طرف بڑھنے لگا۔ مارشل برینا کی نظر اس پر پڑی اور اسے روک کر کہا "اگر شہنشاہ کو کوئی درخواست دینی چاہتے ہو تو مجھے دیدو، میں پیش کر دونگا۔" نوجوان نے جواب دیا "میں خود نپولین سے زبانی گفتگو کرنا چاہتا ہوں" یہ کہکر نوجوان پیچھے ہٹا۔ مارشل نے خیال کیا کہ وہ واپس جا رہا ہے۔ مگر اس کے مڑتے ہی نوجوان نے پھر آگے بڑھنا شروع کیا۔ مارشل کو شک ہوا اور اس نے ایک افسر کو حکم دیا کہ اسے گرفتار کر لیا جائے یہ واقعہ کسی نے نہیں دیکھا۔ سب فوج کے قواعد کے تماشے میں مصروف تھے۔ تھوڑی دیر بعد افسر نے واپس آکر مارشل کو خبر دی کہ نوجوان کی جیب سے خنجر نکلا ہے جو سفید کاغذ میں لپٹا تھا جنگی قواعد ختم ہونے کے بعد مارشل نوجوان کو دیکھنے لگا۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہ چارپائی پر پڑا ہے اس کے سامنے ایک عورت کی تصویر نوٹ بک اور چند سکے رکھے ہیں۔ مارشل نے سوال کیا "تمہارا نام؟" "صرف نپولین کو بتاؤں گا۔" "تم اس خنجر سے کیا کرنا چاہتے تھے۔؟" "نپولین کو بتاؤں گا۔" "شہنشاہ کی جان لینا چاہتے تھے۔؟" "ہاں!" "کیوں ــــ؟"

نپولین کو جواب دوں گا۔" چند منٹ کے بعد نپولین کو اس واقعہ کی اطلاع ہو گئی اس نے نوجوان کو اپنے سامنے طلب کیا نوجوان کی شکیں کسی تھیں نپولین کے سامنے پہنچ کر وہ ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا۔ نپولین ——"تم فرانسیسی جانتے ہو—؟" نوجوان۔"بہت کم" نام—؟ " فریڈ ریک سٹابس—!" وطن—؟" جرمن!" باپ کا پیشہ؟" "پروٹسٹنٹ پادری۔" "تمہاری عمر—؟" "اٹھارہ برس۔" "خنجر سے کیا کرنا چاہتے تھے۔"؟ " آپ کو قتل—"

"تم دیوانے ہو؟"

" ہرگز نہیں—"

" بیمار ہو—؟"

" نہایت تندرست ہوں۔"

" مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہو۔؟"

" کیونکہ تم نے میرے وطن کو بدبخت بنا دیا ہے۔"

" کیا میں نے تمہارے ساتھ بھی کچھ برائی کی ہے۔؟"

" ہاں میرے ساتھ بھی اور ہر جرمن کے ساتھ بھی۔"

" تمہیں اس جرم کے لئے کس نے بھیجا ہے؟"

"کسی نے بھی نہیں۔ میں خود اپنے اس اعتقاد سے آیا ہوں کہ تمہیں قتل کر کے اپنے وطن اور تمام یورپ کو تمہارے شر سے نجات دیدوں گا۔"

"آج سے پہلے بھی تم نے مجھ کو دیکھا تھا۔؟"

"ہاں ارنٹ فورٹ میں ———"

"اس وقت بھی میرے قتل کا ارادہ تھا۔؟"

"ہرگز نہیں میں سمجھتا تھا۔ تم پھر کبھی جرمنی پر اعلان جنگ نہ کرو گے اس وقت میں تم سے محبت کرتا تھا ———"

"یہاں وائنا میں کب سے ہو ——"

"دس دن سے ——"

"اتنے دن خاموش کیوں رہے ؟"

"آج سے پہلے کوئی مناسب موقع نہیں ملا۔"

"میں پھر پوچھتا ہوں۔ دیوانے ہو یا بیمار ؟"

"دونوں میں سے کوئی بھی نہیں۔"

"میں کورونیسار کو بلاتا ہوں۔"

"یہ کون شخص ہے ——؟"

"ڈاکٹر ——!"

"لیکن مجھے ڈاکٹر کی مطلق ضرورت نہیں"

تمام حاضرین پر خاموشی طاری ہو گئی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر آیا اور نبض دیکھی۔ جوان نے کہا۔

"کیوں ڈاکٹر میں بالکل تندرست ہوں ؟"

ڈاکٹر نے نپولین سے عرض کیا ——!

"یہ بالکل تندرست ہے" نوجوان نے خوش ہو کر نپولین سے کہا۔

"میں نے پہلے عرض کر دیا تھا"

نپولین کو لڑکے کی جرأت پر از حد تعجب ہوا تاہم اس نے پھر گفتگو شروع کی۔

"تم سخت ناسمجھ اور ناعاقبت اندیش ہو اپنے اور اپنے خاندان کے دشمن ہو۔ تاہم میں جان بخشی کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ تم ندامت کرو اور معافی چاہو ——"

"ندامت! معافی! ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ البتہ مجھے اپنی ناکامی پر افسوس ضرور ہے۔"

"تم شاید جرم کو کھیل سمجھتے ہو۔"

"تمہارا قتل جرم نہیں! مقدس فرض ہے۔"

"تمہارے پاس سے یہ کس کی تصویر برآمد ہوئی؟"

"میری محبوبہ کی!"

"وہ تمہاری جان پر رنجیدہ ہوگی۔؟"

"نہیں بلکہ وہ میری ناکامی پر رنجیدہ ہوگی۔ وہ بھی تم سے ویسی ہی نفرت کرتی ہے جیسی میں۔"

"اگر میں معاف کردوں تو احسان مانوگے؟"

"ہرگز نہیں! بلکہ دوبارہ قتل کرنے کی کوشش کرونگا۔"

نپولین کو نوجوان کی دلیری پر حیرت ہوئی اور افسوس کے ساتھ گردن مارنے کا حکم دیدیا۔